علامہ اختر کچھوچھوی

فن اور شخصیت

ڈاکٹر غلام ربانی فدآ

www.gulamrabbanifida.wafasite.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب؛ **علامہ اختر کچھوچھوی فن اور شخصیت**

تالیف؛ غلام ربانی فدا

سن اشاعت؛ 2013

تعداد؛ 1000

قیمت؛ 100 روپئے

ناشر: آل انڈیا تحریک فکر نعت ہیرور

کمپوزنگ؛ غلام ربانی فدا

نعت کمپوزنگ 09741277047

www.wafasite.com

www.gulamrabbanifida.wafasite.com

gulamrabbanifida@gmail.com

فہرست

انتساب
اپنی بات
ولادت/آباواجداد
دادا فاضل کچھوچھوی
والد سید کچھوچھوی
سید حسن مثنیٰ انور
اختر کچھوچھوی
تعلیم وتربیت
شوق مطالعہ
ذریعۂ معاش
شادی
مزاج
آغاز شاعری
شیخ الاسلام کا خطاب
محدث اعظم مشن
محدث اعظم ہائسکول
اختر کچھوچھوی بحیثیت مفتیِ دین
اختر کچھوچھوی بحیثیت مفسر قرآن
علامہ اختر بحیثیت شاعر
علامہ اختر بحیثیت غزل گوشاعر
علامہ اختر بحیثیت نعت گوشاعر
برگد مثال اختر کچھوچھوی
باران رحمت اور اختر کچھوچھوی کی نعت گوئی۔ ایک جائزہ
حضرت اختر کی شعری کائنات
روایت اور تہذیب کا امین شاعر؛ اختر کچھوچھوی
فقاہت وعلمی جلالت
اخلاق کریمانہ
اختتامیہ
غلام ربانی فدا شخص وعکس

انتساب

میرے اساتذہ کرام کے نام،،،،،،،،،،،،،،،،
جن کی نظر عنایت کے طفیل میں اس لائق بنا
میری دعا ہے کہ اللہ میرے تمام اساتذہ ذوی الاحترام تندرست رکھے آمین۔

غلام ربانی فدا

عرض مرتب

تما تعریفیں اس خالق حقیقی کے لئے جس نے لفظ کن سے ساری کائنات کی تخلیق کی اور بنی نوع انساں کو تاج کرامت پہنایا اور لوح وقلم، فکر ودانش، عقل سلیم سے نوازا۔ اور درود وسلام کی ڈالیاں نچھاور رہوں سرور کائنات ﷺ کی بارگاہ میں۔

مدت سے دل میں ایک خواہش تھی کہ حضور شیخ الاسلام سیدی ومرشدی مدنی میاں کی ادبی خدمات پر کچھ کام ہو۔ حال ہی میں ایم فل کا ایک مقالہ بعنوان علامہ مدنی میاں ادبی ودینی خدمات نذر سے گزرا۔ رونے کو دل چاہا اور سر پیٹنے کو۔ یہ اور بات ہے فاضل مقالہ نگار نے تحقیق کم نقالی زیادہ کی ہے۔ اتنا ہی نہیں مقالہ نگار نے اندھی عقیدت کا چشمہ آنکھوں پر باندھ کر حضرت اختر کی غزلیہ شاعری کا ہی انکار کر گئے۔ اور صاف لکھتے ہیں کہ حضرت نے ایک بھی غزل نہیں کہی۔ واہ رے ستم طریفی ایک محقق کی کوتاہ بینی۔ حضرت کی ایک غزل نہیں پورا دیوان ہے میں انہیں دعوت انصاف دیتا ہوں تجلیات سخن کا مطالعہ کریں۔ حصہ باران رحمت نعتیہ کلام اور حصہ دوم پارۂ دل غزلیات کا مجموعہ۔ ملک بھر کے دورے، مجالس کی نظامت اور نعتیہ خدمتی اسفار اور ذاتی ذمہ داریاں نے کمر توڑ رکھی ہے۔ ورنہ پھر میں مقالہ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ بھی لے لیتا۔

یہ کتاب آج سے تقریباً ایک سال پہلے کی شائع ہو جانی چاہئے تھی۔ میرے مفلسی نے آپ کے ہاتھوں تک پہونچنے نہ دیا۔ میں نے حضرت کے نام پر قائم بہت سے اداروں سے رابطہ کیا مگر کسی نے شائع کرنے کی امید بھی نہیں دلائی۔ سچ کہتے ہیں۔ حضرت اختر کے نام پر کھانے پینے، اور سلسلہ کے نام پر لوگوں کو بیوقوف بنانے والے کبھی حضرت اختر کے سچے وفادار نہیں ہو سکتے۔

غلام ربانی فدا

علامہ اخترؔ کچھوچھوی بحیثیت شاعر

ڈاکٹر مولانا غلام ربانی فداؔ

عہد حاضر میں دیگر علوم کے ساتھ ساتھ تنقید نعتیہ ادب میں بھی نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔ تنقیدات نعت کے لئے کئی رسائل و کتابی سلسلے نمایاں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان میں نعت رنگ، ماہنامہ نعت، مدحت، اور ہندوستان کا واحد حمد و نعت کا ادبی رسالہ جہان نعت یہ وہ رسالہ ہیں جو نعت کے عمرانیاتی، لسانی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

حضور شیخ الاسلام والمسلمین رئیس المفسرین سند المحققین، سید المتکلمین غوثِ زماں علامہ سید محمد مدنی میاں اخترؔ کچھوچھوی کی شخصیت میں بڑی دلکشی، وسعت اور مقناطیسی قوت پائی جاتی ہے۔ آپ مذہبی اور ادبی دونوں دنیا میں عزت و احترام اور اعتبار کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ خترؔ کچھوچھوی مذہب اور ادب دونوں کی خدمت کو عبادت سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف کی زرخیز زمین پر اعلیٰ منصب پر فائز ہو کر دیگر صوفیانِ کرام کی طرح شعری و نثری تخلیقات سے ہمارے ذخیرۂ ادب و مذہب میں اضافہ کر رہے ہیں۔ حضرت اخترؔ کچھوچھوی کی شخصیت کے کئے گوشے ہیں، جیسے مفسر قرآن، محدث، مفتی، سنجیدہ مقرر، کامیاب مدرس، قابل فخر مرید، لائق مرشد، باصلاحیت منتظم، با کمال صوفی، اور ایک خوبصورت شاعر اس کے علاوہ اور بھی جنہیں میری بصارت نہیں دیکھ سکتی اور قوت احساس اتنی پختہ بھی نہیں کہ اسے محسوس کر سکے۔ یہ سوتے ہیں جہاں پیاسے لوگ آ کر سیراب ہوتے ہیں۔ ان تمام لبادوں میں ملبوس ہونے کے باوجود اُن کا مذہبی و لسانی و اخلاقی قدروں سے رشتہ کسی طرح کمزور نہیں ہوا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں حضرت اختر کے شاعری کے حوالے سے چند لکیریں کھینچتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔

اخترؔ کچھوچھوی کی شاعری کی کئی پرتیں ہیں۔ ان کی شاعری کے کئی دھنک رنگ ہیں اور اُن کے طرز اظہار میں کئی تیور ہیں جو معاصر شعرا سے مختلف ہی نہیں منفرد ہیں۔ اُن کی شاعری کے تمام رنگوں سے اخذ کر کے صرف تین اہم اور خاص خوبصورت رنگ میں آپ کو دکھا رہا ہوں جو ان کی تمام صفحاتِ شاعری پر بکھرے ہوئے ہیں۔

پہلا رنگ: علامہ اخترؔ کچھوچھوی بنیادی طور پر نعت کے شاعر ہیں۔ اخترؔ کچھوچھوی کی جو جذبہ نعت میں صداقت، آہنگ اور تاثیر کی قوت پیدا کرتا ہے، وہ ہے عشقِ رسول جس سے جناب علامہ اختر کا سینہ منور ہے۔ عشق رسول کے نشہ نے اُن کی شاعری کو گلستانِ عقیدت سے مالا مال کر دیا ہے۔ ان کے والہانہ عشق رسول کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کے ان کی زندگی کا ایک بھی لمحہ طریقۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا نہیں ملتا ہے۔ اُن کے مجموعہائے کلام میں باران رحمت (نعتیہ) پارۂ دل (غزل ونظم) ہیں جو کئی بار طبع ہو کر صاحبانِ ذوق اور اربابِ نقد ونظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں بلکہ علامہ اختر کے جذبات عشق، وارفتگیِ شوق، فکری بصیرت اور فنی مہارت کا اثبات بھی کرا چکی ہیں۔

باران رحمت کو ایک خوب صورت گلدستہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ جن میں مختلف اصناف کے گل بوٹے ہیں، نعتیہ غزلیں، نعتیہ قطعات، نعتیہ نظمیں، منقبتیں وغیرہ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنی زبردست وحدت معنوی وذوقی کے باوجود طبیعت میں کہیں تکدّر پیدا نہیں ہوتا اور نہ لطافت میں ذرا سی کمی آتی ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ حضرت علامہ اختر کا خصوصی موضوع نعت ہے۔ اور یہ حضرت علامہ اختر کا کمال نہیں بلکہ نعت رسول کا معجزہ ہے۔

نعت موضوعی صنف سخن ہے جس کے عنوان شہنشاہ کونین صل اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہی اس کی اصل شناخت ہے۔ اسی لئے نعت کے لئے کوئی خاص فارم متعین نہیں۔ مسدس، مثنوی، غزل، رباعی، جس شکل میں چاہے نیاز مند اپنے دل کا ندرانہ بارگاہ مصطفےٰ میں پیش کرسکتا ہے شرط یہ ہے کہ اس کی اصل پہچان قائم رہے۔ یوں تو علامہ اختر کی ساری شاعری کی اس معاشرتی منشور کی ترسیل وتفہیم کا ذریعہ

ہے جو ہادیٔ برحق، محسن انسانیت حضرت محمد خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے بنی نوع انسان کے لئے لے کر آئے تھے، لیکن علامہ اختر نے حضرت رسالت مآب سے اپنی محبت اور عقیدت کے واضح اظہار کے لئے اپنی عمرِ مختصر میں بے شمار عقیدتوں سے مالا مال نعتیں بھی کہیں۔ یہ نعتیں علامہ اختر کے نظریۂ حیات کی ترجمان ہیں۔ ان کی والہانہ وابستگی ہر اس شخصیت سے تھی، جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا علم بردار ہو۔ ایسا وسیع القلب فنکار دنیا کی اس عظیم ترین ہستی، اس محسن اعظم کے محبت کیونکر نہ کرتا ہو جو کسی خاص گروہ، قوم، یا ملک کے لئے نہیں بلکہ پوری کائنات کے لئے باعثِ راحت و رحمت بن کر آئی۔

وَمَا اَرسَلنٰکَ اِلَّا رَحمَۃً لِّلعٰلَمِینَ

(اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے: القرآن)

علامہ اختر اپنی امیدوں کا دامن اسی رحمۃ للعالمین سے وابستہ کرتے ہیں، جو سب جہانوں کے لئے وجہِ تسکین و راحت ہے۔ اور جس کے در سے تشنہ لبوں کے لئے فیضِ عام کے چشمے جاری ہیں۔ علامہ اختر کو اس بات کا بخوبی ادراک ہے کہ اسلامی تعلیمات سے بیگانہ ہو کر مسائل کو جتنا سلجھانے کی کوشش کی جائے وہ مزید الجھ جاتے ہیں۔

دنیا ترے گلشن میں ان کے قدم آتے ہیں
رشک چمن و گل جو خاروں کو بناتے ہیں
جب حسن حقیقی کے جلوے نظر آتے ہیں
پھر نقش خیالی کے نقشے کہیں بھاتے ہیں

دنیا کی غیر مسلم ترقی یافتہ قوموں نے اسلامی اصولوں دیانت داری، سچائی، ایفائے عہد اور رواداری کو اپنا کر ہی منزلِ مقصود پائی ہے۔ لیکن اگر کسی خطے کے باشندے مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہو سکے تو سوائے ذلت کے انہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ لہٰذا علامہ اختر مسائل کے حل کے لئے حضور کی ذاتِ گرامی کی طرف رجوع کا درس دیتے ہیں:

آنسوؤں کو مرے دامن کا کنارہ دے دو
اس میں مضمر مری پُردرد کہانی ہے حضور
آپ سے شرحِ تمنا کی ضرورت کیا ہے؟
سامنے آہ کے ہر سِرِّ نہانی ہے حضور

اس شعر کے بارے میں علی مطہر اشعر کہتے ہیں: ’’یہ اس عظیم شاعر کا نعتیہ شعر ہے جس کی تمام زندگی نو بہ نو مسائل کا شکار رہی ہے۔ اور وہ ان مسائل کے سدباب کے لئے طویل عرصے تک کوشاں رہا ہے۔ پہلے مصرعے کی ساخت اس امر کی غماز ہے کہ اس نے مشکلات اور درپیش مصائب کے حل کے لئے دنیائے بے ثبات کے دانش وروں کے استفادہ کیا، مگر بالآخر اس پر یہ راز منکشف ہوا کہ ان کے مشورے اور زندگی گزارنے کے تمام فارمولے نہ صرف غلط ہیں بلکہ اغراض و مفادات پر مبنی ہیں۔ زندگی کے کسی بھی شعبے میں اگر رہنمائی درکار ہے تو انسان کو حضور سرورِ کائنات کی سیرتِ طیبہ سے کسبِ فیض کرنا چاہئے۔ یہ سیرتِ طیبہ سے کنارہ کشی کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہماری قوم ذلت و رسوائی کے گہرے کنوئیں میں گر چکی ہے۔‘‘ علامہ اختر علم و حکمت کے گہرہائے گراں مایہ کے حصول کے لئے بھی درِ رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

سلام سے پہلے پوری دینا جہالت اور گمرہی کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خاص طور پر عربوں کے سیاسی و سماجی حالات ایسے تھے کہ کسی بھی شخص کو جانی، مالی یا معاشی تحفظ حاصل نہ تھا۔ کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ نہ ہی کوئی قانون تھا۔ جو جب چاہتا دوسرے کی املاک پر قبضہ کر لیتا۔ طاقت ور کا راج تھا اور کمزور کی زندگی اجیرن تھی۔ سرداروں کا انتخاب دولت کے بل بوتے پر ہوتا تھا۔ عوامی حقوق کی کوئی وضاحت نہ تھی، جس کی وجہ سے آئے دن خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ بچیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا۔ غلاموں کے ساتھ ظلم روا رکھا جاتا۔ غرضیکہ پورا سماجی نظام بغیر کسی قاعدہ کے چل رہا تھا۔ جہالت اور گمراہی کی دبیز چادر اوڑھے سوئی ہوئی انسانیت کے لئے خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے حضور کی ذاتِ گرامی کا ظہور اس روشنی کی طرح تھا جس کے دم سے یک دم تمام خوابیدہ مناظر جگمگا

اٹھے:

سنتے ہیں کہ وہ جان چمن آئے ہوئے ہیں
پھر غنچے بتا کس لئے کملائے ہوئے ہیں
روشن نظر آتے ہیں درو بام تمنا
تھوڑی سی نقاب آج وہ سرکائے ہوئے ہیں
پرواہ نہیں اپنا بنائیں نہ بنائیں

ہم تو انھیں اپنائے تھے اپنائے ہوئے ہیں

حضور کا فرمان ہے: مَنصَلَّی عَلَیَّ مَرَّۃً فَتَحَ اللّٰہُ لَہ بَاباً مِّنَ العَافِیۃ (جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے، اللہ تعالیٰ اس پر عافیت کا ایک دروازہ کھول دیتا ہے)۔ علامہ اختر کی عقیدت بھری آواز مذکورہ بالا شعر کے علاوہ ذیل کے شعر میں بھی بابِ عافیت پر دستک دے رہی ہے:

السلام اے رحمت العالمیں
السلام اے مظہر دین مبیں
السلام اے رونق کون ومکاں
السلام اے راز حق کے راز داں
السلام اے صاحب کوثر سلام
السلام اے حق کے پیغمبر سلام

علامہ اختر حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے معتقد اور مداح تھے۔ اسلامی کی تاریخی شخصیات میں سے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اپنا آئیڈیل منتخب کرنا، علامہ اختر کی قلندرانہ اور ترقی پسندانہ سوچ کی غمازی کرتا ہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے جہاں تقسیم دولت کے غیر منصفانہ نظام کے خلاف جد وجہد کے لئے اپنی عمر کا لمحہ لمحہ وقف کر رکھا تھا، وہاں ان کی ذاتی زندگی فقر وغنا سے عبارت تھی۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ حضور کے خاص صحابی اور سچے محب تھے، اور حضور کی حدیث ہے: ”مجھ سے محبت کرنے والوں کی طرف فقر ایسے دوڑتا ہے، جیسے پانی نچان کی طرف دوڑتا ہے۔“[4]

اپنے حقوق کے شعور اور ان کے حصول کے لئے جدو جہد کے ساتھ قناعت اور تقویٰ کے زریں اصول اور دیگر آدابِ زندگی انسانیت نے حضور کی تعلیمات اور سیرتِ طیبہ سے حاصل کئے ہیں ۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی زندگی حضور کے ان اصولوں اور تعلیمات کا عملی نمونہ تھی ۔ حقوق کے لئے جد و جہد اور اس کے ساتھ ساتھ فقر و غنا علامہ اختر کی شخصیت کی بھی نمائندہ خصوصیات تھیں ۔ جو انہوں نے حضور کی سیرتِ طیبہ سے بالواسطہ اور بلاواسطہ حاصل کی تھیں ۔ الغرض علامہ اختر کا فکری نظام مصطفوی منشور سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے ۔ ان کی فکر کسی بھی پہلو سے دیکھیں ، اسلام سے متصادم نظر نہیں آئے گی ۔ طبقاتی معاشرے کی ستم ظریفیوں کے شکار اس بلند کردار اور سچے مسلمان فنکار کی یہ عظمت ہے کہ وہ اپنی متاعِ فکر کو منبعِ فکر و عرفاں حضرتِ محمد کا فیض سمجھتا ہے اور اس کا عقیدت مندانہ اور قطعی اعتراف بھی کرتا ہے:

اللہ اللہ رفعت اشکِ غم ہجر نبی
جونہی ٹپکا آنکھ سے تسبیح کا دانہ بنا
آج بھی سورج پلٹ سکتا ہے تیرے واسطے
اپنے دل کو الفت احمد کا کاشانہ بنا
چاند کی رفعت کو چھو لینا کہاں کی عقل ہے
عقل یہ ہے چاند کو خود اپنا دیوانہ بنا
جانے کتنی ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا ہوں میں
مجھ کو محروم تمنا میرے مولیٰ نہ بنا
دھو کے اپنے نطق کو مدح نبی کے آب سے
اپنی ہر ہر بات اے اخترؔ حکیمانہ بنا

یہ شاعری نہیں بلکہ حقیقت حال کا بیان ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ جان جہاں صل اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں ہے اور قیامت کے دن اُن کی شفاعت ہی ہماری نجات کا سبب بنے گی کہ یہ جان جہاں عین حق ہیں ، سارے نبیوں سے اعلیٰ ، افضل اور ایک بے مثال شخص جن پر اپنے تو اپنے دشمنوں کو بھی اعتماد

ہے۔ ایسے سرکار دو جہاں کی تعریف کرنا نعت کی شناخت کا جزو اعظم ہے۔

اس دیار قدس میں لازم ہے اے دل احتیاط
بے ادب ہیں کر نہیں پاتے جو غافل احتیاط
جی میں آتا ہے لپٹ جاؤں مزار پاک سے
کیا کروں ہے میرے ارمانوں کی قاتل احتیاط
اضطران عشق کا اظہارر ہو بے حرف و صوت
اے غم دل احتیاط اے وحشت دل احتیاط
عشق کی خود ورفتگی بھی حسن سے کچھ کم نہیں
ہے مگر اس حسن کے رخسار کا تل احتیاط
ان کے دامن تک پہونچ جائیں نہ چھینٹیں خون کے
ہے تڑپنے میں بھی لازم مرغ بسمل احتیاط
آ بتاؤں تجھ کو میں ارشاد او ادنیٰ کا راز
ان کے ذکر قرب میں لازم ہے کامل احتیاط
صرف سدرہ تک رفاقت اور پھر عذر لطیف
عقل والو ہے ادائے عقل کامل احتیاط
بس اسی کو ہے ثنائے مصطفی لکھنے کا حق
جس قلم کی روشنائی میں ہو شامل احتیاط
نام پر توحید کے انکار تعظیم رسول
کیا غضب ہے کفر کو کہتے ہیں جاہل احتیاط
اس ادب نا آشنا ماحول میں اخترؔ کہیں
رہ نہ جائے ہو کے مثل حرف باطل احتیاط

یہ وہ محبوب نورانی ہے جو کائنات کی زندگی ہے، یہی اصل ایمان ہے اور یہی روحِ قرآن ہے۔ مراد یہ ہے کہ نعت گوئی میں محض عقیدت سے کام نہیں چلے گا۔ یہاں عقیدہ چاہیے وہ بھی جتنا شدید تر ہوتا جائے گا نعت کی قدر بڑھتی جائے گی علامہ اخترؔ کچھوچھوی کے یہاں محض عقیدت نہیں وہ ”عقیدہ“ بھی ہے

جو ایمان کی دولت بخشتا ہے۔ ایسا ایمان جس کی روح محبت رسول ہے۔ سچے ناعتِ رسول کا دل کوچۂ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا طواف کرتا ہے، زبان ذکر محبوب سے ہر لمحہ تر رہتی ہے اور آنکھ ہجر محبوب میں اشکوں سے وضو کرتی ہے۔ علامہ اخترؔ کچھوچھوی ایسے ہی عاشق رسول ہیں۔

علامہ اخترؔ کچھوچھوی کی حیات کا ہر ورق ہمارے سامنے ہے ہم نے ان کی صبح دیکھی ہے اور شام بھی۔ ہم نے ان کی خلوت دیکھی ہے اور جلوت بھی۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر ہمیں ذاکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر آئے ہیں۔ یاد محبوب میں اُن کی محویت قابل دید اور لائق تقلید ہے۔ ہجر رسول میں ہر وقت بے قرار رہتے ہیں۔ اُن کے جذبات عشق میں بڑی متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔''

عشقِ رسول میں ڈوبے چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور دیکھیئے کہ سچا عشق جذبات خیالات اور الفاظ میں کیسی صداقت، شدت اور تاثیر بخش دیتا ہے۔

بجھ گئی عشق کی آگ اندھیر ہے وہ حرارت گئی وہ شرارہ گیا
دعوت حسن کردار بے سود ہے تھا جو حسن عمل کا سہارا گیا
جس میں پاس شریعت نہ خوف خدا وہ رہا کیا رہا وہ گیا کیا گیا
ایک تصویر تھی جو مٹادی گئی یہ غلط ہے مسلمان مارا گیا
مر کے طیبہ میں اخترؔ یہ ظاہر ہوا کچھ نہیں فرش سے عرش کا فاصلہ
گود میں لے لیا رفعت عرش نے قبر میں جس گھڑی میں اتار گیا
بڑے لطیف ہیں نازک سے گھر میں رہتے ہیں
میرے حضور میری چشم تر میں رہتے ہیں
یہ واقعہ ہے لباس بشر بھی دھوکا ہے
یہ معجزہ ہے لباس بشر میں رہتے ہیں
خدا کے نور کو اپنی طرح سمجھتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں کس کے اثر میں رہتے ہیں

علامہ اختر کچھوچھوی کی نعتیہ فکر ستھرا اسلوب بیان رکھتی ہے۔ اُن کے ذخیرۂ علم میں دین اور ادب، اردو اور فارسی و عربی دونوں کی رونقیں یکجا ہیں اس لئے اُن کے اسلوب و اظہار میں دونوں کے انعکاسات ملتے ہیں۔ وہ جہاں عربی و فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں وہیں اودھ اور دہلی کی شستگی سے بھی اُن کا لسانی انسلاک نظر آتا ہے۔ ثقیل اور بھاری بھرکم الفاظ کے ساتھ عام فہم، رواں اور بول چال کے آسان الفاظ بھی اُن سے مانوس نظر آتے ہیں۔ اُن کے اظہار و اسلوب میں جہاں تنوع اور رنگارنگی ہے وہیں فنی اظہار میں شفافیت اور جذبے کی تپش بھی ہے۔ انہوں نے اپنی نعتوں کا خمیر عشق رسول صل اللہ علیہ وسلم کی آنچ میں تیار کیا ہے۔ اس لئے اُن کا ہر شعر عشق رسول کے تاروں سے لپٹا نظر آتا ہے۔ اُن کے یہاں محض الفاظ کی بازی گری نہیں بلکہ جذبۂ عقیدت کا پر خلوص اظہار ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار پڑھئے اور علامہ اختر کچھوچھوی کی نعت گوئی کے محاسن پر سر دھنئے۔

حسن خورشید نہ مہتاب کا جلوہ دیکھو
آؤ احمد کے کفِ پا کا تماشہ دیکھو
دیکھنے والو دیارِ شہِ بطحا دیکھو
فرش کی گود میں ہے عرش معلی دیکھو

☆☆☆

سوچتا ہوں کیا کہوں میں، کیا نظر آنے لگا
وہ ریاض برزخ کبریٰ نظر آنے لگا
آنکھ جب تک بند تھی اک آدمی سمجھا تجھے
اور جب وا ہو گئی کیا کیا نظر آنے لگا
ان کی یادوں میں جو ٹپکا اشک اختر آنکھ سے
منزلت میں عرش کا تارہ نظر آنے لگا

☆☆☆☆

اے حسین بن علی تیری شہادت کو سلام
دین حق اب نہ کسی دور میں تنہا ہوگا
رب نے چاہا تو قیامت میں سبھی دیکھیں گے
ان کے قدموں میں پڑا اختؔر خستہ ہوگا

وہ مری جان بھی جان کی جان بھی میرا ایمان بھی روح ایمان بھی
مہبط آیات قرآں بھی اور قرآں بھی روح قرآں بھی
نوروبشریٰ کا یہ امتزاج حسیں جیسے انگشتری میں چمکتا نگیں
عالم نور میں نور رحمٰن بھی عالم انس میں پیک انسان بھی

علامہ اختؔر کچھوچھوی کی نعتیہ شاعری جہاں عشق رسول کی روح سے مملو ہے وہیں قرآن و حدیث سے ماخوذ مضامین، معجزات نبوی، تاریخی واقعات اور اصلاحی وتبلیغی خیالات بھی اسے تنوع اور رنگارنگی کی کیفیت عطا کرتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ فنی طور پر اُن کی نعتیہ شاعری ایسی بے شمار خوبیوں کی حامل ہے جن کی تلاش ایک کہنہ مشق اور بڑے شاعر سے کی جاسکتی ہے۔ تشبیہ، استعارہ تمثیل اور پیکر تراشی کی مثالیں تو بڑی آسانی سے مل سکتی ہیں، اُن کی شاعری میں وہ تکنیکیں بھی ملتی ہیں جو شعری مہارت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ چھوٹی بحروں کی کاٹ، طویل بحروں کا ترنم، مشکل ردیفوں کا استعمال، نادر مگر خوش رنگ ترکیبیں گڑھنا اور محاوروں سے برجستگی اور روانی پیدا کرنا وغیرہ، ایسے حربے ہیں جن سے اشعار میں ادب کا بانکپن اور فکروفن کی بہار اپنے جلوے بکھیرتی ہے اس قسم کے بیشتر اشعار قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں کیونکہ نعتیہ شاعری میں یہ نیا لب ولہجہ اُنہیں متحیر کرتا ہے اور علامہ اختر کو معاصر نعتیہ ادب کے سب سے منفرد ممتاز اور نمایاں شاعر کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے۔

دوسرا رنگ: علامہ اختؔر کچھوچھوی بنیادی طور پر نعت کے شاعر ہیں مگر اُنہوں نے غزلوں

نظموں اور رباعیات وغیرہ میں بھی اپنے پاکیزہ اور اعلیٰ افکار کی روشنی بکھیری ہے۔ اُن کی غزلوں میں ایک خاص رکھ رکھاؤ کی کیفیت موجود ہے۔ بقول ڈاکٹر امین اشرف: یہ سوال اہم نہیں ہے کہ حضرت اختؔر نے شاعری کی شروعات غزل سے کی ہے، نظم سے یا نعت سے ’’باران رحمت‘‘ (نعتیہ شاعری) اور پارۂ دل (غزلیہ شاعری) کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اول الذکر کلام میں رچاؤ، پختگی اور الفاظ ومحاورات پر حاکمانہ قدرت زیادہ بھرپور ہے اور اس کے مقابلہ میں فنی ہنرمندی سے بھرپور غزلوں کے علاوہ ایسی غزلیں بھی ہیں جن کا مطالعہ اس امر کا غماز ہے کہ یہی ابتدائی نقوش ہیں۔:

انہوں نے اُن سوقیانہ جذبات، مریضانہ موضوعات اور غیر مہذب افکار سے غزل کو یکسر پاک رکھا ہے جو غزل کے لئے معیوب اور باعثِ عار ہیں۔ اُن کی غزلوں میں پاکیزگی بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی اور ذوق ونظر کی طہارت بھی۔ اُن کی غزلیں پڑھتے ہوئے جہاں ذوق جمال کی تسکین ہوتی ہے وہاں فکر کی نئی پہنائیوں سے آشنائی بھی۔ یہ خصوصیت نہ صرف انہیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے بلکہ ۱۹۸۰ کے بعد آسمانِ ادب پر روشن ہونے والے شعرا میں ایک اہم مقام بھی عطا کرتی ہے۔

علامہ اختؔر کچھوچھوی کی غزل میں ان کی سنجیدہ روی اور مزاج کی روحانی تاب قاری کو فی الفور اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ تقریباً تین دہائیوں پر پھیلا ہوا ان کا کلام انہیں اِس عہد کا ایک معتبر ذہین اور اچھا شاعر ثابت کرتا ہے۔ اب وہ شاعری کی اُس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں شاعری خود شاعر کی ذات میں گم ہوجاتی ہے اور شاعر کی ذات مکمل شاعری ہوجاتی ہے۔ تبھی تو ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں:

عشق کی اصطلاح میں ہمدم
موت کہتے ہیں مسکرانے کو

پھر اس میں آیا کہاں سے کمال رعنائی
اگر یہ کہکشاں ان کی راہ گزار نہیں
عظمت انسانیت سمجھے کوئی ممکن نہیں
خاک کا ذرہ سہی لیکن فلک آغوش ہے

علامہ اختر جذبات کی پیکر تراشی کرنے والے شاعر ہیں ۔ ان کے اسلوب میں روایتی شاعری کی مٹھاس اور لہجے میں تر و تازگی اور فکر و خیال کی بے شمار نیرنگیاں موجود ہیں ۔ چاہے وہ حمد ہو، نعت ہو، غزل ہو یا نظم ۔

علامہ اخترؔ نے ہر صنف میں ندرت بیاں کے جوہر دکھائے ہیں ۔ بنیادی طور پر وہ نعت کے شاعر ہیں ۔ معزز علمی و ادبی گھرانے سے تعلق ہونے کی بنا پر فن شعر و ادب انھیں وراثت میں مل گیا لیکن ان کا طبعی میلان خود آفریدہ ہے ۔ کسی شاعر کے گھر جنم لینے والا بچہ خود بھی شاعر ہو قطعی ضروری نہیں ۔ یہ تو بس خدا کی شان کریمی ہے کہ جسے چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے نواز دیتا ہے ۔ علامہ اختر نے جو شاعری کی ہے وہ وجدان کے بل بوتے پر کی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں اثر آفرینی موجود ہے ۔ انداز بیاں یکسر سادہ و سلیس ہے ۔ مگر فکر کی اڑان اپنی آغوش میں آفاقیت کو سمیٹے ہوئے ہے ۔ انھوں نے خوب سے خوب تر کی تلاش کی ہے ۔**

علامہ اختر کے اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر علامہ اختر کی شاعری میں فنی رچاؤ کے بالمقابل جذباتیت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ لفظیات کے برتاؤ میں بھی وہ طاق نہیں ۔ ان کی شاعری شعوری و ارادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا بے ساختہ پن لیے ہوئے ہے جس میں احساسات کی اتھاہ گہرائیاں نظر آتی ہیں ۔ موضوعاتی نظموں میں بھی انھوں نے تغزل کی چاشنی برقرار رکھی ہے ۔ بہت سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ دلنشیں انداز میں پابند اور نظمیں کہی ہیں ۔ یہ ان کی فنکاریت کی نظیر ہے ۔

علامہ اخترؔ کچھوچھوی کی غزلیہ شاعری میں مجھے سب سے زیادہ وہ فضا پسند آئی جو اُن کی زندگی کے واقعات، ان کے ذاتی محسوسات اوران کی شخصیت کے طبعی افتاد سے ابھرتی ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، جذبے کی صداقت کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کے احساسات کسی عالم بالا کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی کی سطح پر کھیلنے والی لہریں ہیں۔ انہیں نازک چنچل، بے تاب، دھڑکتی ہوئی لہروں کو انہوں نے شعروں کی سطروں میں ڈھال دیا ہے، اوراس کوشش میں انہوں نے انسانی جذبے کے ایسے گریز پا پہلوؤں کو بھی اپنے شعر کے جادو سے اجاگر کر دیا ہے جو اس سے پہلے اس طرح ادا نہیں ہوئے تھے:

یہ بھی ہیں چہرۂ پرنور کے پروانے دو
دوش پر کاکل خمدار کو بل کھانے دو
کہہ رہی ہے رخ پہ بکھری ہوئی زلف حسیں
ابر کے پیچھے کوئی برق تپاں روپوش ہے
بدمست گھٹاؤ یہ تو کہو اس وقت ہمیں کیا لازم ہے
جب ساغر عارض موج میں ہو جب زلف پریشاں ہوجائے

اان کی شاعری سوچ، طرز احساس اورفنی برتاؤ ہر لحاظ سے اردو شاعری کے روایتی مزاج سے یکسر مختلف ہے۔ اوراپنے اندر انفرادی رنگ وروپ رکھتی ہے۔ علامہ اخترؔ کچھوچھوی کے اسلوب، لہجے اورموضوعات کی انفرادیت کا یہ عالم ہے کہ اُن کی شاعری سب سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ نعتوں کے مجموعوں سے قطع نظر صرف ’’پارۂ دل‘‘ پڑھ جائیے، یہ حقیقت پہلی نظر میں سامنے آئے گی۔

یہ بھی ہیں چہرۂ پرنور کے پروانے دو
دوش پر کاکل خمدار کو بل کھانے دو
کہہ رہی ہے رخ پہ بکھری ہوئی زلف حسیں

ابر کے پیچھے کوئی برق تپاں روپوش ہے
بدمست گھٹاؤ یہ تو کہو اس وقت ہمیں کیا لازم ہے
جب ساغر عارض موج میں ہو جب زلف پریشاں ہو جائے

اپنی شاعری کو زندگی کی معنویت سے آشنا کرنے میں علامہ اختر کچھوچھوی کے براہ راست حسی تجربوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ یہ حسی تجربے بھی محض سرسری نہیں ہیں بلکہ ماضی کے خوابوں کی صورت میں شاعر کے لاشعور کا جزو بن گئے ہیں کہ علامہ اختر کچھوچھوی ان کے بغیر اپنے حال اور مستقبل کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ زندگی کی بدلی ہوئی قدروں کے بارے میں ہر شاعر اظہار خیال کرتا ہے اور رنج وغم کا اظہار بھی کرتا ہے مگر علامہ اختر کچھوچھوی ماضی کو حال سے اور حال کو مستقبل سے ہم آہنگ کر کے زندگی کے اس جشن بے چارگی کو متحرک تجسیم میں بدل دیتے ہیں:

مجھے معلوم ہے اے اشتراکیت کے فرزندو
حصار عافیت کے دعویٰ ہائے بے نشاں کب تک
ہے میری زندگی ویرانیوں کا منظر خستہ
مرے دم سے قفس صیاد کا آباد ہوتا ہے
گلہ کوئی بھی چیرہ دستیٔ صیاد سے کیا ہو
جہاں پر خود گل تر تیشۂ صیاد ہوتا ہے

علامہ اختر کچھوچھوی کی ایسی سوچ کا مابعد الطبیعاتی عقیدے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان کی سوچ براہ راست جیسا کہ میں نے اوپر کہا اُن کے حسی اور ذہنی تجربوں کی دین ہے۔ اپنے گرد وپیش کے عمل اور رد عمل کے نتیجے میں انہوں نے اس طرح سوچا اور اس طرح محسوس کیا ہے۔ تنہائی، عدم تحفظ زندگی کی بے معنویت، اخلاقی خلا، ذات کا کرائسس، فرد کی گمشدگی، فنا کا خوف، حالات کی یکسانیت، مشینی زندگی کی جبریت، اقدار کی شکست وریخت، آج کی زندگی کے ایسے محرکات ومسائل

ہیں جو ہر باشعور آدمی کے دل و دماغ کو ایک طرح کی الجھن میں ڈالے ہوئے ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کی حساس طبیعتوں نے اِن باتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر قبول کیا ہے۔ چنانچہ علامہ اخترؔ کچھوچھوی کے یہاں بھی اس قسم کے محسوسات کا اظہار ملتا ہے اور بعض جگہ بڑی شدومد کے ساتھ ملتا ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ اُن کے یہاں یہ احساسات منفی نقطۂ نظر یا نا اُمیدی کے تصورات پیدا نہیں کرتے۔ جدید شعرا کے یہاں یہ محسوسات نا اُمیدی اور مایوسی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے تھے اور زندگی اُن کے یہاں اپنی معنویت ہمیشہ کے لئے کھو چکی تھی۔ علامہ اخترؔ کچھوچھوی کی شاعری جدیدیت سے اسی لئے برسرِ پیکار نظر آتی ہے کہ ان کی شاعری زندگی کے منفی رویوں کی شاعری نہیں ہے۔ کہیں کہیں اس طرح کا لمحاتی احساس ان کے یہاں ضرور ابھرتا ہے۔ لیکن یہ احساس جب فکر و تامل کی منزلوں سے گزرتا ہوا کیف جذبی اور عاطفہ بن کر شعر میں نمودار ہوتا ہے تو مثبت رویے میں بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کے پاس ایسی قوت کا عقیدہ ہے جو مصائب کے بعد انسان کو بشارت کی ضمانت دیتا ہے۔ یاس کے اندھیرے میں امید کی چاندنی چٹکاتا ہے اور زندگی کی بے معنویت کو تازہ معنویت عطا کرتا ہے

؎

آدمی کیا ہے آدمیت کیا
حسن سیرت نہیں تو صورت کیا
فرشتہ ہو گیا اخترؔ تو کیا ہے
کہو فرزند آدم بن کے آئے

مثبت افکار اور امید کی کرنوں سے معمور یہ وہ ذہن اور عقیدہ ہے جس نے بھیانک سے بھیانک حالات میں بھی زندگی کو علامہ اخترؔ کچھوچھوی کی نظر میں مہمل، لغو اور عذاب نہیں بننے دیا۔ اس عقیدے اور یقین نے ان کی شاعری میں جس طرح جگہ بنائی ہے اور اپنے فکر و فن میں انہوں نے اسے جس طرح برتا ہے وہ ثبوت ہے کہ شاعر ایک صالح اور نورانی طرز زندگی کا حامل ہے۔ اور

ثبوت اس کا بھی ہے کہ علم وفضل، قرآن وسنت اور الٰہیات کی قوت نے اُن کی عام فکر کے ساتھ زندگی کے متعلق محسوسات کو بھی مثبت، روشن اور صحیح راہ دکھانے میں پورا تعاون پہنچایا ہے۔ علامہ اخترؔ کچھوچھوی کی شاعری وجدانی اور فکری گہرائیوں کی شاعری ہے۔

ایسا لگتا ہے علامہ اخترؔ کچھوچھوی نے دنیاوی بدیوں اور شیطنتوں کو صوفیا کی داخلی آنکھوں سے دیکھنے کا جتن کیا ہے۔ وہ تخلیق ادب کے عصری تقاضوں سے باخبر ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری نئے اخلاقی اور انسانی اسباق کا خزینہ سمیٹے ہوئے ہے۔

رنگینیٔ مجاز حقیقت نما ہوئی
منزل پہ پہونچے سلسلہ عاشقی سے ہم
عشق کی اصطلاح میں ہمدم
موت کہتے ہیں مسکرانے کو
آنکھ ہے اشک باریوں کے لئے
دل ہے چوٹوں پہ چوٹ کھانے کے لئے

تیسرا رنگ: اردو نظم کی ابتدائی اشکال وہ مثنویاں ہیں جو عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار حکومت میں کہی جاتی رہیں۔ بعد ازاں جب مغل فرماں روائی کا آغاز ہوا تو ہند میں ایرانی اثرات کے تحت غزل کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا، لہٰذا نظم نہ پنپ سکی۔ انگریزوں کے ہاتھوں مغلیہ سلطنت کے زوال نے ہند کے معاشرے میں کچھ داخلی انقلاب پیدا کئے۔ صدیوں پرانی اخلاقی، سماجی اور مذہبی اقدار کی شکست وریخت کا عمل شروع ہوا۔ نئے معاشی اور نفسیاتی مسائل نے سر اٹھایا۔ فرقہ واریت اور طبقاتی نظام معیشت نے ”گھر“ کی اکائی کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ شکست اور محکومی کی ذلت کا احساس عام ہوا۔ اور ان سب مسائل کی عکاسی کے لئے نظیر اکبر آبادی نے نظم کی ضرورت کو سب سے

پہلے محسوس کیا۔ بعد ازاں جدید عہد کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اور مغربی ادب کے زیرِ اثر آزاد اور حالی نے بھی جدید شاعری کا علم بلند کیا۔ لہٰذا انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا اور وطن اور فطرت کے مناظر کے علاوہ دوسرے عوامی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ حالی نے محسوس کیا کہ قافیہ اور ردیف کا التزام جدید مسائل کے اظہار و ابلاغ میں مانع ہو رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں قافیہ، ردیف کے خلاف آواز اٹھائی: ”اگرچہ وزن بھی قافیہ کی طرح شعر کا حسن بڑھا دیتا ہے، جس سے اس کا سننا کانوں کو نہایت خوشگوار معلوم ہوا ہے، اور اس کے پڑھنے سے زبان زیادہ لذت پاتی ہے۔ مگر قافیہ، خاص کر ایسا، جیسا کہ شعرائے عجم نے اس کو نہایت سخت قیدوں سے جکڑ بند کر دیا ہے اور پھر اس پر ردیف اضافہ فرمائی ہے، شاعروں کو بلا شبہ ان کے فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے۔“

علامہ اختؔر کچھوچھوی کی شعری کائنات کا تیسرا آسمان ان کی نظموں سے منور ہے۔ اور اپنی متنوع خوبیوں سے مجھے حیرت زدہ کر رہا ہے۔ عہد حاضر میں ”نظم گوئی“ کس قدر اہمیت کی حامل ہے اسے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری کے جس رنگ روپ کی وکالت کی تھی آج اس کی اہمیت نسبتاً زیادہ محسوس کی جا رہی ہے کیونکہ بگڑتے معاشرے اور دم توڑتی ہوئی قدروں کی اصلاح اور زندگی کا ذریعہ موضوعی نظمیں ہی ہو سکتی ہیں۔ جس تسلسل اور تاثراتی وحدت کے ساتھ نظم میں کسی موضوع کو پیش کیا جا سکتا ہے غزلوں میں نہیں۔ اس لئے علامہ اختؔر کچھوچھوی نے جب نظموں کی طرف توجہ کیا اُنہیں اپنے افکار اور پیغامات کی ترسیل کا زیادہ بہتر موقع میسر آیا۔ علامہ اختؔر کچھوچھوی خطیب ہیں اور اسلامی و تاریخی شعور سے پوری طرح بہرہ ور، اسلئے اُن کی نظموں میں ”بیانیہ“ اسلوب حاوی ہے۔ یہ نظمیں اُن کی غزلوں کی طرح علامتی استعاراتی یا تمثالی نہیں ہیں، ان میں تفصیل، سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ ترسیلی اسلوب میں بات کرنے کا انداز پایا جاتا ہے۔ الفاظ، تراکیب، تشبیہات اور استعارے بھی غزلوں کے مقابلے میں زیادہ سلیس و سادہ

اور رواں دواں استعمال کیئے گئے ہیں۔ یعنی نظموں میں عصری حوالہ زیادہ واضح، روشن اور صاف ہے اور زبان بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔

علامہ اختؔر کچھوچھوی کے یہاں عام طور سے دو قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ ایک وہ جو موضوع یا معنی کو سامنے رکھ کر وضاحتی انداز میں لکھی گئی ہیں یعنی جو ایک مخصوص معنی تک ذہن کی فوری رسائی کروا دیتی ہیں۔ اور دوسری وہ جن سے معانی برآمد ہوتے ہیں یعنی اُس کی تہہ داری قارئین کے فرق کے ساتھ معانی میں فرق بھی پیدا کرسکتی ہے۔ صرف ایک نظم ”تجزیہ“ ملاحظہ کیجئے۔

لوگ کہتے ہیں بصد فخر و مباہات اختؔر

اک حسینہ سربازار بنی ہے رانی
دودھ سے چہرہ دھوتی ہے بجائے پانی
اس کی دنیا میں اندھیرے کا کوئی نام نہیں
اس کے ہاتھوں میں مصیبت کا کوئی جام نہیں
اس کی تقدیر کا تابندہ ہوا سیارہ
اژدھے رنج و الم کے ہوئے نو دو گیارہ
اس کے حق میں شب تیرہ بھی ہے صبح رخشاں
مہر درد بام پہ ہیں مہر و قمر آویزاں
اس کی دنیا میں ترنم کے سوا کچھ بھی نہیں
اس کے ہونٹوں پہ تبسم کے سوا کچھ بھی نہیں

میں یہ کہتا ہوں شرافت کا جنازہ نکلا

نظم گوئی کا یہ انداز ایک طرف ذاتی تجربے اور مشاہدے کا عکس ہے تو دوسری طرف مختلف

زبانوں کے اعلیٰ ادب سے مکالمے کا نتیجہ ہے۔ جذبے کی سادگی سیدھے سادے مگر لطیف الفاظ کی مدد سے برجستہ ادا ہوئے ہیں۔ قاری ایسے لفظوں سے مسحور ہو کر معنی کو گرفت میں لیتے ہوئے ایک انبساط والی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ علامہ اختؔر کچھوچھوی کی ایسی نظم غزل کے ایک شعر کی طرح ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ علامہ اختؔر کچھوچھوی کو نظموں کے مقابلے میں غزلوں سے زیادہ لگاؤ ہے۔ اور غزلوں میں ان کی شناخت کے امکانات قدرے روشن نظر آتے ہیں۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اُن کی نظموں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اُن کی نظموں سے رغبت کو سراہا جا سکتا ہے۔

علامہ اختؔر کچھوچھوی کی نظمیں یوں تو اُن کی زندگی سے وابستہ مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں لیکن بالواسطہ طور پر انسانی رشتوں کی شکست و ریخت، سماجی زندگی کی ناقابل برداشت باتیں، روایت اور تہذیب کی شکستگی، مادیت اور مغربیت سے پیدا ہونے والے فکری فساد، فرقہ وارانہ منافرت اور روزمرہ کے تجربات کو فن کی شکل دیتی ہیں۔ اور بڑی فنکاری سے ہر تجربے کے پس پُشت ایک فکر، ایک درس اور ایک سبق پیش کر دیتی ہیں۔ گویا علامہ اختؔر کچھوچھوی معنی کی ترسیل کے بجائے پیغام کی ترسیل پر یقین رکھتے ہیں۔ اور نظموں کے تعلق سے اُن کا یہی نظریۂ فن ہے۔ انہوں نے فکری و عملی پیغام ہو یا واردات و کیفیات قلبی اور درون انسانی میں چھپے ہنگامے، سب کو کنایاتی اور علامتی الفاظ کے بجائے واضح طور پر سلیس زبان میں پیش کرنا مقدم جانا ہے اور زندگی کے معاشرتی، اخلاقی اور اصلاحی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر میں یہاں ان کی ایک مشہور نظم ”ہندوستان کے مسلمانوں سے خطاب“ پیش کرنا چاہوں گا۔

اے مسلماں صید دام خواب غفلت ہوشیار
وقت کہتا ہے کہ لے ہاتھوں میں اپنے ذوالفقار
اٹھ کہ تجھ کو ہے بدلنا گردش لیل و نہار
اے محمد کے سپاہی دین حق کے جاں نثار
تھا کبھی تو باعث نقش و نگار گلستاں

آج کیوں ہے تنگ گلشن اور عار گلستاں
تیری غفلت نے کیا ہے باطلوں کا سربلند
تیری گردن میں حمائل ہے غلامی کی کمند
تیری ہستی بن گئی ہے تختۂ مشق گزند
پھر رہا ہے آج تو بن کر سراپا درد مند
لرزہ بر اندام جو رہتے تھے تیرے نام سے
تھر تھراتا ہے آج تو ہے ان کے چاپ گام سے
ہاں تری یہ خانہ جنگی طاقت باطل ہے آج
اللہ اللہ بھائی کا خود بھائی ہی قاتل ہے آج
سنگ دل اپنوں کے حق میں کیوں مثال سل ہے آج
دشنوں کے درمیاں لیکن بہت بزدل ہے آج
الاماں صد الاماں تم اور خون اتحاد
پیکر رحم و کرم اور مائل بغض و عناد

علامہ اخترؔ کچھوچھوی نے اپنے وطن کے آشوب اور اپنی قوم کے مصائب کو سیاسی یا سائنسی فارمولوں کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اپنے دکھی دل کی بے چینی کو آشکارا کیا ہے۔ اسی کرب کو ''صبح آزادی'' میں یوں دیکھا جاسکتا ہے

غم کے مارو مسرت کا پیام آ ہی گیا
آفتاب حریت بالام بام آ ہی گیا
ہو مبارک یہ سرور و انبساط زندگی
میکشو! ہونٹوں تک آزادی کا جام آ ہی گیا
برق نے تو لاکھ چاہا تھا کہ رستہ روک دیں

آسمان حریت پر میرا گام آ ہی گیا
اب شبستان وطن کی ظلمتیں کافور ہیں
آسماں پر نیر گردوں خرام آ ہی گیا
آج اپنے ہاتھ میں اپنے وطن کی ہے زمام
نالۂ مظلوم آخر کار کام آ ہی گیا
ذلت محکومیت سے ہم کو چھٹکارا ملا
اپنے ہاتھ اپنے گلستاں کا نظام آ ہی گیا
لو نسیم صبح گاہی لائی پیغام نشید
مرحبا وقت وداع وقت شام آ ہی گیا
منھ کی کھانا پڑ گیا افرنگیوں کی چال کو
خود شکاری آج اختؔر زیر دام آ ہی گیا

قدرت کے خارجی مناظر پر اردو میں بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں علامہ اختؔر کچھوچھوی نے بھی ایسی نظمیں لکھی ہیں۔ علامہ اختؔر کچھوچھوی کی شاعری محض مشاہدے کی شاعری نہیں ہے۔ مشاہدات اُن کے محسوسات کا صرف پس منظر فراہم کرتے ہیں۔ احساس کا یہ منقش اظہار علامہ اختؔر کچھوچھوی کا منفرد اسلوب ہے۔ یہ محض شاعری نہیں صداقت بیانی ہے جو آخری سچائی کی سمت جانے والوں کے سفر کو آسان اور آسودہ بنا دیتی ہے۔

ساحل کا تصور آتے ہی دوڑا ہوا ساحل آ جائے
لب آشنا حرکت سے بھی نہ ہوں اور زیست کا حاصل آ جائے
خاموش زباں بھی خشک رہے اور ساقی محفل آ جائے
اتنی تو کشش دل میں میرے اے جذبہ کامل آ جائے
جب خواہش منزل پیدا ہو خود سامنے منزل آ جائے

تسلیم کہ شیوہ حسن کا ہے خوشیوں میں بھی رنگ غم بھرنا
مانا کی حسینوں کی عادت ہے زخم پہ بھی نشتر دھرنا
دربار حسیناں میں پھر بھی کہتا ہے یہ آنکھوں کا جھرنا
اے شمع قسم پروانوں کی اتنا تو مری خاطر کرنا

اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آ جائے

علامہ اختر کچھوچھوی کے دل و دماغ میں بیشتر ماضی کی یادیں تحریک پیدا کرتی ہیں۔ مگر یہ یادیں اتنی تابندہ اور پاکیزہ ہیں کہ ان کی بازیافت میں نہ حال کو کسی گزند کا احتمال ہے اور نہ مستقبل کو کسی نقصان کا خطرہ ہے۔ جو چیز خیالات واحساسات کو روشن کرتی ہو اور انسان کے دوامی جذبوں پر آفتاب طلوع کرتی ہو اس کی ضرورت حال اور مستقبل دونوں کو ہے۔ علامہ اختر انہیں مثبت، روشن اور منور بازیافتوں کے شاعر ہیں۔ ثبوت کے لئے آپ ان کی ڈھیر ساری نظمیں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہاں صرف چند اشعار دیکھئے:

کرم ہے میرے کریم تیرا اسیر مختار ہو گیا ہوں
ہزاروں آزاد رشک میں ہیں میں وہ گرفتار ہو گیا ہوں
تیری انا میں فنا سے پہلے میری انا کی بساط کیا تھی
مگر اب اپنے کو دیکھتا ہوں تو ایک سنسار ہو گیا ہوں
حضور ایسی فنا عطا ہو ملے بقائے دوام جس سے
زمانہ دیکھے تو بول اٹھے تمہارا اظہار ہو گیا ہوں
جہاں میں جاؤں گا تیری نسبت کی روشنی میرے ساتھ ہوگی
ملی ہے جب سے تیری غلامی امین انوار ہو گیا ہوں
رہین احسان جام و ساغر یہ میری سرمستیاں نہیں ہیں
شہید کیفِ شراب ناب نگاہ سرکار ہو گیا ہوں

علامہ اختؔر کچھوچھوی کا تاریخی شعور بہت پختہ ہے۔ اسلامی تاریخ اور انسانی اقدار کی خوشبو اُن کی نظموں کو نئی روشنی اور نئے رنگ آہنگ سے معطر کرتی ہے۔ اُنہوں نے تلمیحاتی انداز میں تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہی نہیں کیا، بلکہ تاریخ کے کسی واقعے یا واردات کو قصے کے پیرائے میں نقل کر دیا ہے تاکہ وہ واقعہ نہ صرف قاری کو مطلع کرے بلکہ اُس کے ذہن و دل پر اپنے اثرات بھی قائم کرے۔ مورخ اور شاعر کے طریق باز یافت میں یہی تو فرق ہے کہ مورخ کی باز یافت محض باز یافت ہے۔ شاعر کی باز یافت فن میں ڈھل کر پیش رفت کا کردار ادا کرتی ہے۔ جذبے، خیال اور فکر کے لئے آخری حقیقت کی سمت نمائی صرف اسی طرح ممکن ہے اور علامہ اختر اس طریقہ کار سے مکمل طور پر واقف نظر آتے ہیں۔ بہار اسلام، حُسن خلق، پرکشش شخص، قدیم رشتہ، نرالی آرزو، اور پہلا مسلماں، وغیرہ نظمیں اس کی عمدہ مثال ہیں۔ نظم ”مجاہد دوراں سید مظفر“ کے محض چند ابتدائی مصرعوں پر ایک نظر ڈالئے، تاریخ کو کس خوب صورتی اور شاعرانہ رنگ و آہنگ کے ساتھ فن کے قالب میں ڈھالا گیا ہے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

ہمارا نالۂ شب گیر مستجاب آیا
بڑا حسین زمانے میں انقلاب آیا
مری امید کی موجیں یم تمنا سے
نہ کیوں تڑپ کے اٹھیں وقت اضطراب آیا
تھی جس کے فکر وتدبر سے بے خبر دنیا
عروج چرخ سیاست سے کامیاب آیا

علامہ اختؔر کچھوچھوی شاعر کے ساتھ عالم دین، صوفی اور متشرع شخصیت کے حامل ہیں اس لئے اصلاحی مذہبی اور اخلاقی ذہن وفکر رکھتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ وہ صرف عالم دین نہیں بلکہ عاشق رسول ہیں۔

اس لئے بنیادی طور پر وہ نعت گوئی کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں اور نعت گو کہلانا ہی پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف نعتوں میں بلکہ غزلوں، نظموں وغیرہ، میں بھی اُنہوں نے مدحت رسول کے گل بوٹے بکھیرے ہیں۔ اِس لحاظ سے علامہ اختؔر کچھوچھوی کا ایک اور امتیاز سامنے آتا ہے کہ انہوں نے نعت کے لئے فارم کی قید نہیں رکھی ہے، جس صنف میں بھی قلم اُٹھایا اُس میں نعت گوئی سے وسعت پیدا کر دی ہے۔ اُن کی نظموں پر بھی اِس کا گہرا اثر ہے۔

آخر میں علامہ اختؔر کچھوچھوی کی ایک خوب صورت نظم کا ذکر کر کے اپنی گفتگو ختم کروں گا جو مجھے بہت پسند آئی اور وہ ہے اُن کا ''سلام''۔ سلام بر حضور خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے والے شعرا کی تعداد کثیر ہے، مگر اردو میں چند ہی سلام ایسے ہیں جنہیں مقبولیت دوام حاصل ہوئی۔ اُن میں امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کا سلام ''مصطفےٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' اور حفیظ جالندھری کا سلام ''سلام اُئے آمنہ کے لال ائے محبوب سبحانی'' معرکۃ الآرا ہیں۔ علامہ اختؔر کچھوچھوی کا سلام ایسی زمین میں ہے ایسی ہی روانی لطافت اور کشش رکھتا ہے کہ بس!!!!۔ چند اشعار ملاحظہ فرمالیں:

السلام اے رحمت العالمیں
السلام اے مظہر دین مبیں
السلام اے رونق کون ومکاں
السلام اے راز حق کے راز داں
السلام اے صاحب کوثر سلام
السلام اے حق کے پیغمبر سلام
السلام اے خاتم پیغمبراں
السلام اے رہنمائے رہبراں
السلام اے راحت و آرام جاں
السلام اے دستگیر بیکساں
السلام اے پیکرحسن و جمال

السلام اے صاحب فضل و کمال
السلام اے رہبر دین خدا
حامی و ناصر مددگار ومعیں
مدعائے مژدہ عیسیٰ سلام
منتہائے مقصد موسیٰ سلام
کیجئے مقبول اختؔر کا سلام

شاہ ولیں کے نبیوں کے امام

”پارۂ دل“ کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ علامہ اختؔر کچھوچھوی نظم کہنے کا ہنر تو جانتے ہی ہیں مستزاد یہ کہ ان کے یہاں اپنی روایت، اردگرد، پس منظر، پیش منظر اور اپنے اسلاف سے جڑے رہنے کا جو تسلسل ہے وہ ان کی ارفع فنکاری کا سبب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ جزئیات پر جتنی گہری نظر ڈالتے ہیں اور خارجی کائنات کو داخلی کائنات سے جس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں یہ اُن کے معاصر نظم نگاروں کے یہاں مفقود ہے، یعنی ’پارۂ دل‘ ہر اعتبار سے علامہ اختؔر کچھوچھوی کی نظم گوئی کی صلاحیت اجاگر کرتا ہے۔ سہل اور سادہ اسلوبِ بیان کا یہ نظم نگار اپنے فکرونظر کے اعتبار سے توجہ طلب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تخلیقی عمل اسی طرح صیقل ہوتا رہا اور توضیحی انداز بیان پر تھوڑا سا قابو پالیا گیا تو بحیثیت نظم گو بھی اردو ادب میں علامہ اختؔر کچھوچھوی کے امتیازات کی شناخت قائم ہو جائے گی۔

☆☆☆

علامہ اختؔر کچھوچھوی بحیثیت غزل گو

ڈاکٹر سید امین اشرف

”پارۂ دل“ کے خالق حضرت اختؔر کچھوچھوی صاحب دیوان شاعر حضرت سید محمد محدث اعظم (ہند) کے فرزند ہیں اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے خانوادۂ محدث اعظم کو خانوادۂ اشرفیہ کی مختلف شاخوں میں امتیاز و اختصاص حاصل ہے۔ مسلک اہل سنت کی ترویج واشاعت میں اس خاندان کی مساعیٔ جمیلہ اور اس خانوادے کے افراد کا تبحرِ علمی اس کی شناخت ہے۔ خود خانوادۂ محدث اعظم میں حضرت اختؔر کچھوچھوی کی ایک امتیاز شان ہے، ہشت پہل بیک وقت عالم دین، فقیہ، مفسر قرآن، خطیب، شیخ طریقت، اور صوفی منش ہونے کے علاوہ صاحب طرز انشا پرداز اور شاعر بھی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت اختؔر شاعری کی طرف کیوں مائل ہوئے۔ اس کا جواب صاف ہے ایسی شخصیت جو گوناگوں فضائل کی حامل ہو اس میں ایک وصف اور سہی۔ یہ اوصاف ایک ہمہ گیر شخصیت کی غمازی کرتے ہیں۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت وسعت نظر سے مالا مال ہوتی ہے اور اس کی دلچسپیوں کی آماجگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی رہتی ہے، دوسرے یہ کہ ایک وہبی صفت ہونے کے علاوہ شعر گوئی کا یہ ملکہ حضرت اختؔر کو ورثے میں ملا ہے۔ داد علامہ فاضل کچھوچھوی کو داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ باکمال شاعر تھے، والد مرحوم حضرت محدث اعظم صاحب دیوان شاعر، برادر اکبر سید مثنیٰ انور صاحب طرز ادیب اور شاعر اور خود حضرت اختؔر کے جد اعلیٰ حضرت مخدوم

اشرف جہانگیر سمنانی شاعر۔ آپ کا کلام دیوان اشرف ناپید ہے، مگر تاریخ و سیر کی مختلف کتابوں میں حضرت کے جستہ جستہ اشعار مل جاتے ہیں جو پند و نصائح سے مملو ہیں۔

تیسرے یہ کہ صوفی پر وجد، سرمستی اور حال کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے اظہار کے لئے نثری نگارشات سے زیادہ معتبر اور قوی شاعر کا یہ میڈیم ہے اس سے منسلک ایک سوال اور رہ جاتا ہے کہ حضرت اختؔر کچھوچھوی نعت کے شاعر ہیں تو پھر غزل کی طرف کس طرح راغب ہوئے یہ امر قرین قیاس ہے کہ جو شاعر ایک صنف سخن پر قادر ہے اسے کسی دوسری صنف سخن کو اپنانے میں دشواری نہیں ہوتی۔ نعت ہے کیا، شاعری میں عشق رسول ﷺ کا اظہار، عشق رسول تو حضرت اختؔر کی زندگی کا عنوان ہے اور ان کی شاعری کے رگ و پے میں جاری و ساری مگر جہاں ایک شعر گوئی کا معاملہ ہے انتداء غزل گوئی سے ہی ہوگی۔ سودؔا، ذوقؔ، انشاؔ قصیدہ نگار شعرا ہیں مگر ان کی شاعری کا آغاز اصلاً غزل سے ہی ہوا ہے۔ فلسفہ خودی کا مبلغ اور قرآنی تعلیمات کا شارح اقبالؔ اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کرتا ہے۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

میرؔ انیس جیسا باکمال شاعر جو مرثیہ گوئی پر حاکمانہ قدرت رکھتا ہے، اول اول اس نے غزلیہ شاعری کی ہے:

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

یہ سوال اہم نہیں ہے کہ حضرت اختؔر نے شاعری کی شروعات غزل سے کی ہے، نظم سے یا نعت سے ”باران رحمت“ (نعتیہ شاعری) اور پارۂ دل (غزلیہ شاعری) کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اول الذکر کلام میں رچاؤ، پختگی اور الفاظ و محاورات پر حاکمانہ قدرت زیادہ بھرپور

ہے اور اس کے مقابلہ میں فنی ہنر مندی سے بھرپور غزلوں کے علاوہ ایسی غزلیں بھی ہیں جن کا مطالعہ اس امر کا غماز ہے کہ یہی ابتدائی نقوش ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

گستاخ کہہ کے چل دیئے رد سلام میں
کیا یہ صلہ ملا ہے مرے احترام کا
بے ساختہ تھے ملنے پر ایسا بدل گئے
دیتے نہیں جواب ہمارے سلام کا
دل کی دنیا اجڑنے والے
آج آئے ہیں دل لگانے کو
ادائے بے رخی نے مارڈالا
تری فتنہ گری نے مارڈالا
سوچتاہوں تو کانپ جاتاہوں
بے قراری کہیں قرار نہ ہو
غالباً کوئی جان بہار آگیا
ہر کلی کے لبوں کو ہنسی مل گئی
تیرے ستم پر تجھ کو دعادوں
دیکھ مرا ارمان ہے کیسا
حشر کاانتظار کیامعنی
بے حجابی نہیں قیامت کیا
میرے نیاز سے ہے دنیائے نازتاباں
لیکن سمجھ رہے ہیں عالی جناب الٹا

کیا بات ہے یہ داور محشر کے مقابل
ہم ہیں بت خاموش وہ شرمائے ہوئے ہیں
اے مرے بیداد گر بیداد پر بیداد ہو
تجھ سے کیا مطلب کہ کوئی شاد یاناشاد ہو
اے جان جہاں تجھ کو ہے کچھ اس کی خبر بھی
بے تاب ترے ہجر میں دل بھی ہے جگر بھی
لگے حسن ماہ پر بھی ذرا ایک تازیانہ
ذرا گلعذار چہرے سے نقاب تو اٹھانا
میرے ناصح نے جب انھیں دیکھا

دامن پندو وعظ چھوٹ گیا

محوبالا اوراس قبیل کے بیشتر اشعار کا مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرت اختؔر کے عنفوان شباب کی شاعری ہے جس کا اصل مرکز مادی عشق ہے اور اس عشق کی تال پر یہ اشعار رقص کر رہے ہیں۔ عشق و محبت کا فیضان بنی نوع انسان میں قدر مشترک ہے یہ کسی خاص وضع قطع کے انسان یا کسی مخصوص زاویہ نظر تک محدود نہیں۔ اس کا وجود مختلف دل و دماغ میں اس کی بساط یا جذباتی شخصیت کے مطابق ہوتا ہے۔ غزل میں اس کا اظہار برملا ہوتا ہے۔ اشارے کنائے میں ہوتا ہے یا بصد حزم واحتیاط اور اکثر یہ بھی مشاہدے مین آتا ہے کہ رمز وکنایہ میں بھی اظہار نہیں ہو پاتا اور کمال ضبط کی وجہ سے دل کی بات دل میں رہ جاتی ہے۔

اس خیال کی وضاحت میرؔ کے اس شعر سے ہوتی ہے

کہتے ہو کہ یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا

سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہیں کہا جاتا

حضرت اختؔر کے مندرجہ بالا اشعار پر امیؔر مینائی اور داغ دہلوی کا رنگ حاوی ہے۔ ان میں محبوب سے شکوہ وشکایت ہے مگر گریہ وزاری نہیں۔ ضبط فغاں ہے آہ و بکا نہیں، شوخی طبع ہے مگر پھکڑ پن نہیں، لاگ ڈانٹ، خوش باشی یا وصال طلبی شمہ برابر نہیں۔ حسن پرستی یا عشق مجازی ہے مگر ہوس ناکی نہیں۔ لطافت اظہار اور پاکیزگی بیان کے ساتھ زبان کا چٹخارہ پن ہے مگر ابتذال یا سوقیانہ پن نہیں اور یہ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ ایک عارف کا کلام ہے۔

سن وسال میں بتدریج ارتقا اور مشق وممارست کے ساتھ حضرت اختؔر کی غزلیں بھی ارتقائی منزلیں طے کرتی نظر آ رہی ہیں۔ کہیں غالبؔ کی ہلکی سی جھلک جلوہ گر ہے، کہیں آتشؔ کی قلندرانہ شان، کہیں اقبالؔ سے ایک ذہنی وجذباتی قربت ہے تو کہیں پنڈت برج نارائن چکبستؔ کا پرتو، خون جگرؔ کی آبیاری کی وجہ سے کلام کا رنگ نکھرتا چلا جا رہا ہے۔ فکر میں بالیدگی پیدا ہو رہی ہے اور انداز نظر میں حکیمانہ بصیرت، غالبؔ کی غزل کا مطلع ہے:

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

حضرت اختؔر کی غزل کا مطلع ہے

پھر وہی شوخ نظر یاد آیا
راحت قلب و جگر یاد آیا

چھ اشعار پر مشتمل یہ غزل رعنائی خیال اور اسلوب کی تازہ کاری کا ایک خوبصورت مرقع ہے
غالبؔ کی غزل کا مطلع ہے

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

بحر میں ہلکی سی تبدیلی کے ساتھ حضرت اختؔر کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

وہ وفا پیکر سنا ہے محو ناؤ نوش ہے
کیا خبر اس کو مری شمع خاموش ہے

مندرجہ بالا شعر میں جذباتی ہیجان انگیزی نہیں بلکہ یہ حزنیہ لے اور نشاطیہ آہنگ کا آمیزہ ہے

غالبؔ کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت اختؔر کی غزل کا مطلع اسی زمین پر ہے؛

یاد رہے صحن چمن میں ترا خنداں ہونا
اور پھولوں کا وہ انگش بدنداں ہونا

ماضی کے رومان پرور لمحات کو شاعر نے اپنی یادوں کی گرفت میں لیا ہے اور محبوب کی خندیدگی کے سامنے پھولوں کی شگفتگی کے دعوے کا بطلان کرتا نظر آتا ہے یہ میرؔ کے شعر سے ملتا جلتا ہوا شعر ہے:

چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا
جمال یار نے منھ خوب اس کا لال کیا

راقم الحروف کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اساتذۂ سخن کی زمین پر یا ان کے رنگ میں شعر کہنا دشوار ہے مگر حضرت اختؔر اس پل صراط سے صحیح سلامت گزر گئے ہیں۔ غزلوں میں جا بجا اقبالؔ سے دلچسپی کے کوندے لپکتے ہیں اقبالؔ کے ایک شعر کا مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے عاصی بندے کی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو پسند ہیں۔ دیکھئے اس مضمون سے متعلق شاعر مشرق کے شعر سے حضرت اختؔر کی عارفانہ نظر کو کس قدر مناسبت ہے؛

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے
(اقبال)

ضیا جو پھوٹتی ہے قطرۂ اشک ندامت سے
اسے مہر درخشاں کی کرن کہنا ہی پڑتا ہے
(اختؔر)

پنڈت برج نرائن چکبست کا شعر ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشان ہونا

حضرت اختؔر کہتے ہیں:

زندگی ہے بے نیاز زندگی ہونے کا نام
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

چکبست کا شعر ایک سائنسی حقیقت کا انکشاف ہے اور حضرت اختؔر کا شعر نفسی حقیقت کا یعنی ہم جسے موت کہتے ہیں وہ دراصل زندگی کا تسلسل ہے۔ غوث اعظم کا قول ہے کہ دولت مند وہ ہے جو دولت سے بے نیاز ہو۔ حضرت اختؔر کہتے ہیں اصل زندگی وہی جو زندگی کی سطحی ترغیبات اور نفسانی خواہشات سے آزاد و بے نیاز ہو اور موت کا کھٹکا یوں دامن گیر رہے جیسے یہ کل آنے والی ہے اصل زندگی دنیائے دوں کی نفی ہے۔ آتش کی مشہور غزل ہے:

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

حضرت اختؔر کی ایک غزل اسی زمین پر ہے:

جو پیش ان کو کبھی ہدیۂ لہو کرتے

تو اس طرح انھیں ہم اور خوبرو کرتے

اول تو شعر مذکور میں 'جوؔ اور 'تو' کے صوتی آہنگ کا حسن، دوسرے یہ خیال کہ عاشق کی جگر کادی محبوب کے لب ورخسار کا غازہ ہے۔ تیسرے 'ہدیہ لہوؔ اور 'خوب روؔ جیسے نوک پلک سے درست الفاظ شعر کے صوری ومعنوی حسن میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ اس پوری غزل کا آہنگ موسیقیت سے لبریز اور معنویت کی بوقلمونی سے رنگارنگ ہے اس طرح کے اشعار شاعر کی شگفتہ مزاجی پر دال ہیں۔ عاشق کا محبوب کو لہو پیش کرنا کمال عشق ہے اور محبوب کی قدرشناشی وقدرافزائی بھی۔

اساتذہ سخن کے علاوہ اور بھی دیگر کلاسیکل شعرا کے لہجے کی چھاپ صاف نظر آتی ہے یا ان کی زمین پر مشق سخن، اساتذہ کی زمین میں شعر کہنا جان جوکھم کا کام ہے مگر حضرت اختؔر نے اس میدان کو کامیابی سے سر کیا ہے۔ ان شعرا کی زمینوں پر یا ان کے رنگ میں شعر کہنا ہی فنی چابکدستی اور شاعرانہ ہنرمندی کی دلیل ہے، سوال یہ ہے کہ کیا حضرت اختؔر کی شاعری مختلف کلاسیکل شعرا کی بازگشت ہے۔ ایسا اس لئے نہیں ہے کہ حضرت اختؔر کے مضامین ان شعرا کے موضوعات سے یکسر مختلف ہیں دوسرے یہ کہ اگر صرف اور صرف ایک شاعر کے اثرات کی غزلیہ شاعری پر ہوتے تو کہا جاسکتا تھا کہ یہ شاعری فلاں شاعر کی شاعری کا چربہ ہے اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عالیشان مکان کی تعمیر میں سنگ وخشت، چوب ورنگ اور آب وآہن ممد ومعاون ہوتے ہیں اسی طرح حضرت اختؔر نے جملہ اساتذہ سخن کے لب ولہجے کو اپنی جذباتی اور مفکرانہ شخصیت میں اس طرح جذب کرلیا ہے کہ ان متعدد اور متضاد آوازوں کی آمیزش سے ایک ایسی نئی شعری فضا تیار ہوئی ہے جس میں انفرادی شان پائی جاتی ہے اور بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ لہجہ حضرت اختؔر کچھوچھوی کا اپنا لہجہ ہے۔

حضرت اختؔر کی عاشقانہ شاعری کی خصوصیات کیا ہے اول تو یہ کہ شاعر کا احساس جمال نہایت تیز اور شدید ہے انگریزی رومانی شاعر کیٹس (KEATS) نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ ''ایک ادنیٰ

مخفی اور ہلکا سا بھی احساسِ جمال میرے جسم کی رگ رگ میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے“ حضرت اخترؔ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے مگر ہیجان میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ہے اور اس کے اظہار میں رکھ رکھاؤ، قد و گیسو کی قیامت خیزیوں، لب و رخسار کی حلاوت اور چشم و ابرو کی فتنہ انگیزیوں کے ذکر میں عامیانہ پن نہیں ہے۔ مثلاً حضرت اخترؔ کی سراپا نگاری دیکھئے:

یہ بھی ہیں چہرۂ پرنور کے پروانے دو
دوش پر کاکل خمدار کو بل کھانے دو
کہہ رہی ہے رخ پہ بکھری ہوئی زلف حسیں
ابر کے پیچھے کوئی برق تپاں روپوش ہے
بدمست گھٹاؤ یہ تو کہو اس وقت ہمیں کیا لازم ہے
جب ساغر عارض موج میں ہو جب زلف پریشاں ہو جائے

دوسرے یہ کہ ان عشقیہ غزلوں میں مریضانہ کیفیت نہیں ہے ہمارے اکثر شعراء غزلوں میں اس امر کا اعادہ کرتے رہتے ہیں کہ عاشق مجبور محض ناکام اور غم و آلام میں محصور ہے اور محبوب ستم پیشہ، کج رفتار، بد دماغ اور تغافل شعار ہے۔ حضرت اخترؔ کے کلام میں عاشق کی مہجوری اس کی زندگی کا تقاضہ ہے محبوب کی ستم رانیوں کا نتیجہ نہیں اس عالم مہجوری میں حضرت اخترؔ محبوب کی تغافل کا رونا نہیں روتے بلکہ جذب و سرور اور کیف و انبساط میں ڈوب جاتے ہیں اس طرح قاری کی طبیعت پر بجائے افسردگی شگفتگی طاری ہو جاتی ہے تیسرے یہ کہ ان غزلوں میں عاشق کا کردار ایک غیرت مند اور خود دار انسان کا کردار ہوتا ہے وہ در محبوب پر ناصیہ فرسائی نہیں کرتا اور محبوب ستم گر ہوتے ہوئے بھی کہیں کسی ”رقیب“ کا ذکر نہیں ہے یا ہرجائی نہیں ہے، تمام عشقیہ شاعری میں ضمناً بھی کہیں کسی ”رقیب“ کا ذکر نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ ایک صوفی باصفا کی عشقیہ شاعری ہے اس سلسلہ میں آخری نکتہ یہ ہے کہ ان غزلوں کا محبوب ایک تصویر خیال یا مثالی محبوب ہے جس کے حسن

وجمال کو آب ورنگ عشق نے بخشا ہے۔ اس کی تائید حضرت اخترؔ کے اس شعر سے ہوتی ہے:

دل عشق آفریں سے ہے مقام حسن کی رفعت
کیا نظروں میں تجھ کو آسماں اے جان جاں میں نے

ان اشعار کے علاوہ ’’پارۂ دل‘‘ میں ایسی بھی غزلیں ہیں جن کو خالص سماجی وسیاسی صورت حال سے سروکار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے شاعر طبعاً حساس ہوتا ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر، حضرت اخترؔ کے ان اشعار میں جن کا تعلق اخلاقی وسماجی اقدار کی پامالی سے سے ہے یا سیاسی زبوں حالی سے، لہجے کی تندی، احتجاج، چیخ و پکار، گھن گرج، یا نعرہ بازی اور بلند آہنگی نہیں ہے، ان میں جرأت اظہار کے ساتھ ساتھ آہستہ سلگنے کی کیفیت ہے ان اشعار میں اپنےموقف یا ردعمل کا اظہار شاعر نے سلیقہ مندی سے کیا ہے جس طرح ایک نہایت ہلکا رنگ کسی تصویر میں چمک پیدا کر دیتا ہے اسی طرح چند علامات کے استعمال سے شاعر نے فضا آفرینی کا کام کیا ہے اور چند اشارے صورت حال کی افراتفری، زمانے کے پیچ وخم اور وقت کے نشیب وفراز کی تصویر واضح طور پر نمایاں کر دیتے ہیں یہ علامات ہیں باغباں، گلشن، آشیاں۔ صیاد۔ گل تر۔ شمع محفل اور قفس وغیرہ۔ مادر وطن کے فروغ اور اس کی مادی، تہذیبی اور معاشی خوشحالی میں ہندوستان کی مختلف قوموں اور نسلوں کی قربانیاں شامل ہیں اور جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے ان کے تعلق سے اس حقیقت کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار میں شاعر کا لہجہ کرب انگیز اور طیور طنزیہ چاشنی سے بھرپور ہے:

کیا ہے یہ بھی اک احسان تجھ پر باغباں میں نے
چنا ہے تیرے گلشن کو برائے آشیاں میں نے

نفاق وافتراق وفرد کی بے بسی، انحطاط پذیر معاشرے کی ابتری و بدحالی اور آئے دن فرقہ وارنہ فسادات ہلاکت خیزی کا عکس اس شعر میں دیکھئے:

گلہ کوئی بھی چیرہ دستیٔ صیاد سے کیا ہو
جہاں پر خود گل تر تیشۂ صیاد ہوتا ہے

چند خوشحال مملک اور معدودے چند افراد اور ترقی یافتہ حکومتیں دنیا کی غریب قوموں اور غریب ملکوں کا کس ڈھٹائی اور کس ڈھڑلے سے استحصال کرتی ہیں اس کی عکس ریزی اس شعر میں دیکھئے:

ہے میری زندگی ویرانیوں کا منظر خستہ
مرے دم سے قفس صیاد کا آباد ہوتا ہے

خلاقی اقدار کا زوال اس شعر میں ملاحظہ ہو جہاں ایک کی برتری و بالادستی کی اساس دوسرے کی کمزوری اور خستہ حالی ہو:

نہ پوچھو شادمانی باغباں کی
لگی ہے آگ میرے آشیاں کی

شکست خواب ملاحظہ ہو:

شمع امید فروزاں تھی جہاں پر اخترؔ
اسی محفل میں گلے کٹ گئے ارمانوں کے

یہ عجیب تضاد ہے کہ جسے ہم صبح آزادی کہتے ہیں اس میں غلامی کی شام اور اس کی تاریکی تھرتھرا رہی ہے لبوں پہ مہر ہے اور خیالات کے اظہار پر قدغن:

تاریکی وطن تو مٹی ہے مگر یہ کیا
صبح وطن رنگ ہے غربت کی شام کا

زوال پذیر معاشرے کی پیداوار ہے فرد کی ریاکاری اور منافقت:

لب پہ ہنسی اور ہاتھ میں پتھر

آج کا یہ انسان ہے کیسا

اشتراکیت کی یلغار نے دنیا کے سیاسی استحکام اور معاشی نظام تہہ و بالا کردیا۔ آج وہی اشتراکیت پارہ پارہ ہے۔ اس کے برعکس خالص روحانی نظام بھی ملک، معاشرے اور افراد کی ترقی کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ ایک نظام کو یکسر نظرانداز کر کے شخصیت کی نشونما ہوسکتی ہے نہ معاشرے کی۔ اس کا واحد حل صرف اسلام میں ہے جو دونوں کے امتزاج میں روازن واعتدال کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کیلئے نمونہ ہمارے سامنے سیرت رسول ﷺ ہے اس خیال کے اظہار کے لئے شعر ذیل میں غیر معمولی بصیرت اور دروں بینی کی کارفرمائی ہے:

مجھے معلوم ہے اے اشتراکیت کے فرزندو
حصار عافیت کے دعویٰ ہائے بے نشاں کب تک

شعر مذکور کی ساری معنوی خوبی اس کے رمزیہ لب و لہجے ''دعویٰ ہائے بے نشاں'' میں مستور ہے، یعنی کھوکھلا دعویٰ یالایعنی تصور اور بے حقیقت فلسفہ۔

''پارۂ دل'' میں ایسی غزلیں بھی ہیں جنہیں غزل مسلسل کہا جاسکتا ہے۔ ایسی غزل میں خیال کیمرکزیت ہوتی ہے اور ایک شعر دوسرے شعر سے باہم مربوط مگر غزل کی ہئیت کا بنیادی اور روایتی تصور ریزہ خیالی ہے۔ عشقیہ غزلوں اور ایسے اشعار کے علاوہ جن کے محرکات سیاسی، سماجی اور اخلاقی ہیں۔ بیشتر اشعار تصوف کے زمرے میں آتے ہیں حضرت اخترؔ کی صوفیانہ شاعری کے حوالے سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ بقول شیخ علی حزینؒ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' جیسا کہ ولیؔ دکنی، سراجؔ اورنگ آبادی، میرتقی میرؔ، آتشؔ، غالبؔ اور فانیؔ کی شاعری پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حضرت اخترؔ کی شاعری صوفیانہ مصطلحات سے گراں بار ہے نہ اس میں فلسفیانہ موشگافیوں کی خیال آرائیاں۔ پھر حضرت اخترؔ کی صوفیانہ شاعری کے محرکات کیا ہیں۔ اول تو یہ کہ جن عناصر سے حضرت اخترؔ کی طبع باطنی مرکب ہے وہ ہیں فقر واستغنا، صبر و توکل، بے نیازی

اور دردمندی، دوسرے یہ کہ حضرت اخترؔ ایک کامل شیخ طریقت ہیں اور ظاہر ہے کہ تصوف کی خوبیوں اس کے امکانات وتعینات واوصاف کو انہوں نے اپنی قلندرانہ شخصیت میں جذب کرلیا ہے، راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ حضرت شیخ تصوف کے مختلف مدارج یس گزرے ہیں اور گزر رہے ہیں مثلاً ذکروفکر، واقعہ ومکاشفہ، مجاہدہ ومحاسبہ، مراقبہ، مشاہدہ اور معائنہ۔ قاری کی آسانی کے لئے میں اجمالاً وضاحت کرتا چلوں کہ جب شیخ کا ذہن محسوسات سے غائب ہوجاتا ہے تو اس پر غیب کی باتوں کا ظہور ہوتا ہے، یہی واقعہ ہے۔ یہ واقعہ جب عالم بیداری میں میسر ہو تو مکاشفہ۔ نفس سے جنگ کرنا مجاہدہ۔ اور شیخ کا خود اپنے اعمال کا احتساب کرنا محاسبہ، مراقبہ ہے ذات خداوندی کی یاد مستغرق ہوجانا یہاں تک کہ غیر اللہ کا شعور باقی ہ رہے۔ مشاہدہ ہے ذات باری کو اسما وصفات کے پردے میں دیکھنا اور معائنہ ہے ذات خداوندی کا دیدار اور تجلیات کے پردے کے بغیر کرنا، مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کی اولاد، نورالعین کے فرزند، جگر گوشہ محدث اعظم میں ان صوفیانہ عظمتوں کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں۔ اس لئے یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ تصوف حضرت اخترؔ کی زندگی ہے اور صوفیانہ اشعار اس زندگی اور اس شخصیت کے گوشوں کے عکس ہائے جمیل۔ اس سلسلہ میں جن صوفی شعرا کی صف میں حضرت اخترؔ آتے ہیں وہ ہیں خواجہ میر دردؔ، شاہ نیازؔ احمد بریلوی، شاہ تراب علی قلندرؔ، بیدمؔ وارثی، مولانا آسی غازیپوری اور شاہ حسین اشرفی۔

صوفیا کے نزدیک انسان دوستی کی بڑی اہمیت ہے ان کے نزدیک تمام عالم انسانیت ایک عالمگیر برادری ہے۔ انسان کے دکھ درد کو سمجھنا، تکالیف میں ان کی مدد کرنا، حق کہنا، راہ مستقیم اختیار کرنا اور اخلاقی خوبیوں پر عمل کرنا آدمیت ہے اور شیوۂ انسانیت، لطائف اشرفی میں حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی سے منقول ہے کہ ”میں درجۂ فضلیت وغوثیت تک نماز وروزہ سے نہیں پہونچا ہوں بلکہ خدمت خلق کی حاجت روائی سے“ صوفیا کے نزدیک خدا کے بندے سے محبت خدا سے محبت ہے۔ رواداری اور بے تعصبی صوفیا کی زندگی کا نشان امتیاز ہے۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

حضرت اختؔر کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

آدمی کیا ہے آدمیت کیا
حسن سیرت نہیں تو صورت کیا

اس لئے غالبؔ نے کہا ہے آدمی کو میسر نہیں انسان ہونا اور مولانا روم فرماتے ہیں؛

آدمی را آدمیت لازم است
عود را گر بو نہ باشد ہیزم است

زہد وتقویٰ نیکی اور پرہیزگاری سے انسان میں ذاتی اوصاف تو پیدا ہوجاتے ہیں مگر اصل انسانی مسئلہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان سے اس کے معاملات کس طرح کے ہیں۔ فرد اور معاشرے سے اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے، برے انسان آدم خاکی ہے وہ اس کرۂ ارض پر رہتا ہے۔ آیا وجود ریاضت وعبادت وہ فساد تو نہیں برپا کرتا، شرپسند تو نہیں ہے یا تخریبی کاروائیوں میں تو ملوث نہیں ہے۔ ہمارے سامنے نمونہ سیرت رسول ﷺ ہے، خلفائے راشدین کی زندگی ہے یا اولیاء اللہ کی حیاتِ مبارکہ۔۔۔۔۔ یہ شعر دیکھئے:

فرشتہ ہو گیا اختؔر تو کیا ہے
کہو فرزند آدم بن کے آئے

باالفاظ دیگر صوفی کا مذہب رواداری، صلح کل اور وسیع النظری ہے۔ یہ تمام جہان آب وگل خدائے وحدہ لاشریک کی ذات وصفات کا ظہور ہے اور تمام مظاہر کائنات اس کی ذات وصفات کے آئینے ہیں۔ انسان کا دل وکامل ترین آئینہ ہے جس میں وہ آفتاب حقیقت بہ کمال شان جلوگر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا کے کلا میں ”دل“ ایک اہم علامت ہے۔ یہاں تک کہ اسی وجہ سے ”دل“

کو کعبہ پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ’’از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است‘‘ شعر ذیل میں ’’سومنات‘‘ ایک شاعرانہ تخیل یا تمثیل ہے، اصل شے ہے دل کا مح؛ ظہور الہٰی ہونا جس کے سامنے تاریکیٔ باطل معدوم ہو جاتی ہے اور سوائے جلوۂ الٰہی کچھ نظر نہیں آتا۔ کمال عشق ہے کہ ہر جگہ اللہ ہی اللہ نظر آئے ورنہ آنکھ ایک ایسا چراغ ہے جو بے نور ہو اور دل محض ایک مضغۂ گوشت:

برب کعبہ میں کعبہ سے کم نہ سمجھوں گا
دل حزیں جو ترا سومنات ہو جائے

اس حقیقت کا اظہار اقبالؔ نے اس طرح کیا ہے:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

خود اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنا، معرفت خداوندی حاصل کرنا ہے:

خود کو پانا ہے حقیقت میں خدا کو پانا
اپنے ہی ہاتھ میں ہے صاحب عرفاں ہونا

’فنا‘ کا مطلب ہے کہ انسان کے باطن پر اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ظہور کا غلبہ ہو اور خدا کے علاوہ کسی شئے کا علم و شعور باقی نہ رہے اور فناء الفنا یہ ہے کہ اس بے شعوری کا بھی شعور نہ رہے دل میں صرف خدا کی ذات و صفات کی جلوہ گری ہو اور آنکھوں میں اسی کا جلوہ نظر آئے، یعنی روح کی بصیرت جمال الٰہی میں غرق ہو جائے ’’موت‘‘ شعر ذیل میں اسی فنا یا فناء الفنا کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہے جو بالآخر جسمانی و روحانی ابتہاج و اہتزاز کا نقطہ کمال ہے:

عشق کی اصطلاح میں ہمدم
موت کہتے ہیں مسکرانے کو

اسی موت کی ’’فنا‘‘ تک رسائی آسان نہیں؛

آنکھ ہے اشک باریوں کے لئے
دل ہے چوٹوں پہ چوٹ کھانے کے لئے

کائنات کے ذرے ذرے میں عشق سرایت کئے ہوئے ہے اور کامل انسانوں کے نفوس میں یہ عشق روحانی کی صورت میں متجلی ہے اس عشق یا عرفان سے پہلے ہوس کی منزل ہے جو حسن کا ایک تجسیمی تصور ہے جہاں عاشق کی نظر صرف قد و گیسو اور لب و رخسار تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہوس جب جل کر عشق میں تبدیل ہوتی ہے تو حسن کا تنزیہی تصور ہے اور اس کا پہلا زینہ ہے:

رنگینئ مجاز حقیقت نما ہوئی
منزل پہ پہونچے سلسلہ عاشقی سے ہم

ان صوفیانہ اشعار سے قطع نظر ایسے بھی اشعار ہیں جن میں ذات مصطفی سے حضرت اختؔر کے عشق کی جلوہ فرمائی ہے۔ حضرت اختؔر پر جوش عاشق رسول ﷺ ہیں مدینے کی گلیاں حضرت اختؔر کے نزدیک باغ جناں سے کم نہیں۔ پتہ نہیں کہاں کہاں قدم ناز مصطفی پڑا ہو:

گماں اختؔر ہوا ان کی گلی میں
پہونچ آیا ہوں میں باغ جناں میں

واقعہ معراج کی لطیف اشارے دیکھئے:

پھر اس میں آیا کہاں سے کمال رعنائی
اگر یہ کہکشاں ان کی راہ گزار نہیں
عظمت انسانیت سمجھے کوئی ممکن نہیں
خاک کا ذرہ سہی لیکن فلک آغوش ہے

ان تمام اشعار میں مذہبی عقیدے کی سختی ہے نہ صوفیانہ مصطلحات کی فراوانی، یہ اشعار ایک درویش کامل کی سادگی انسان دوستہ اور حقیقت شناشی کے پرتو ہیں۔ غزلوں میں بدیع و بیان کا تصنع

ہے نہ ملمع کاری، نمود و نمائش اور الفاظ و تراکیب کے طمطراق سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ ایک قلب بے ریا کی طرح یہ اشعار بھی سادہ و سلیس الفاظ اور لطیف احساسات سے مملو ہیں۔ تلمیحات کا استعمال کم سے کم ہے۔ مثلاً سر طور، خضر اور مہ کنعاں وغیرہ، مفرس معرب الفاظ کے استعمال سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے۔ اسی برح مشکل اور پیچیدہ تراکیب سے ترکیب سازی شاعر کی قوت ایجاد اور ذہنی اختراع کا پتہ چلتا ہے۔ مگر ان کے استعمال کی کثرت سے شعر کی لطافت مجروح ہوتی ہے ترکیب سازی کلام اختؔر میں ایک وسیلہ ہے ترسیل و ابلاغ کا۔ کلام میں گل بوٹے بنانے کا نہیں مثلاً چند تراکیب ہیں۔ ناوک نرگس میگوں، منت کش شمع محفل، شمع سوز دردروں رخ ذرہ پرور، کرم شب تاب، شراب ناب، سایۂ زلف، مشکبار کاکل پر پیچ پیچ و خم تقدیر، چشم خشم آگیں، منت پیمانہ و سبو، غیرت خضتہ اور ستم خوردۂ بہار وغیرہ۔ اسی لئے کلام میں سہل ممتنع کے اشعار بیش از بیش ہیں اور یہ شاعر کی فنکارانہ ہنرمندیوں پر دال، اسی طرح تشبیہات و استعارات سے بھی کلام کو نہیں سجایا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ صنعت تضاد سے کام لیگیا ہے۔ تمام اشعار میں آرائش اظہار کے لئے کوئی شعوری کوشش نظر نہیں آتی۔

ان تمام غزلوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ شاعری خشک ہے نہ محض قافیہ پیمائی۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ صوفی پر وجد اور سرخوشی کا عالم طاری ہوتا رہتا ہے۔ پایان کار کسی صوفی شاعر کا کلام سپاٹ اور بے رنگ نہیں ہوسکتا۔ ان غزلوں میں جمالیاتی احساس کی شدت کے ساتھ عصری حسیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے، یہ غزلیہ شاعری ہے یا لطافت احساس، غنائیت اور موسیقیت کا ایک سیل رواں۔ شعری اظہار میں غیر معمولی سرمستی اور والہانہ پن ہے۔ بعض غزلوں میں قافیے کی تکرار اور اس کے پھیلاؤ نے غزل کے حسن کو دو بالا کر دیا ہے۔ مثلاً ’’کروں یا نہ کروں‘‘، ’’ڈر لگتا ہے‘‘، ’’کہنا ہی پڑتا ہے‘‘ وغیرہ۔ مجموعی کلام کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اپنے احساسات و مشاہدات و تجربات کی ادائیگی میں حضرت اختؔر تغزل کا دامن ہاتھ سے نہیں

چھوڑتے ۔بعض اشعار ملاحظہ ہوں جہاں جذبہ وفکر کی آمیزش کوتغزل کے رنگ وآہنگ نے چمکا دیا ہے ۔ یہ اشعار نہایت مترنم بحر میں ہیں ۔

سو رہی ہے مری حسرت مجھے آواز نہ دو جاگ جائے نہ قیامت مجھے آواز نہ دو
ان کی آنکھوں کو نہ تعبیر کروں آنکھوں سے سچ پوچھو تو نظر آتے ہیں میخانے دو
بھٹکنے میں ہے لطف اے خضر ورنہ میں ناوقف راہ منزل نہیں ہوں
عشق نے ان کے عطا کی ہے یہ وحشت اختؔر مجھ کو خود اپنی ہی تصویر سے ڈر لگتا ہے
روشن نظرآتے ہیں در و بام تمنا تھوڑی سی نقاب آج وہ سرکائے ہوئے ہیں
زندگی ان کی نگاہوں سے ملی ہے مجھ کو نوک نشتر کو بھی آتا ہے رگِ جاں ہونا
یہ تیرے پند سر آنکھوں پہ ناصحا لیکن خدا گواہ محبت پہ اختیار نہیں

اپنے ہی چمن کی بات نہیں اختؔر وہ جہاں بھی جاپہونچیں
ہرشاخ خوشی سے جھوم اٹھے،ہرپھول غزلخواں ہوجائے

’’پارۂ دل‘‘ میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں بلکہ’’پارۂ دل‘‘ خود عنوان ہے مجموعہ میں شامل ایک نظم کا،غزل ایجاز واختصار کا آرٹ ہے اور نظم شرح وبسط کا،نظم کا فن ارتکاز کا فن ہے،یعنی مرکزی خیال کی توسیع ۔شعری مجموعے میں شامل زیادہ تر مختصر نظمیں ہیں اور جو نسبتاً طویل ہیں ان میں تفصیل وطوالت دلچسپی میں سدراہ نہیں ہوتی،اظہار و بیان کی صلابت ،فکر واحساس کی گلکاری اورالفاظ ومحاورات پرحاکمانہ قدرت اورجذبات میں ٹھہراؤ ان نظموں کی خصوصیات ہیں،صبح آزادی،نوائے نرم وگرم،ہندوستانکے مسلمانوں سے خطاب اورساقی نامہ خوبصورت نظمیں ہیں ۔اختؔر کیراپی کے نام نظم اورنظم بہ عنوان اظہارتشکر کوبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ۔اصطلاح عروض میں تضمین کسی مشہور مضمون یاشعرکواپنی نظم داخل یاچسپاں کرنا،شاعرنے نہایت فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ اس طرح مصرعہ تخلیق کئے ہیں کہ سب آپس میں شیرشکر نظرآتے ہیں اور ہر شعر بول اٹھتا ہے ۔’’سہرا‘‘ بھی ہمارے شعری ادب میں داخل ہوگیا ہے اس کی نوعیت ذاتی ہے آفاقی نہیں

مگر شامل مجموعہ سہروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں روایت کا غلبہ نہیں ہے بلکہ جدت پسندی ہے اشارے میں محض عروس ونوشاہ کے حسن و جمال کی طرف نہیں بلکہ شانہ بشانہ حکیمانہ رموز ونکات کی طرف بھی اشارے ہیں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عنوان ''سہرا'' ہوتا ہے اور ردیف سہرا مگر ''پارۂ دل'' میں شامل سہروں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں الفاظ وتراکیب کے دروبست میں تغزل کی آب وتاب، رنگینی ورعنائی ہے اور کسی نہ کسی حکیمانہ بصیرت کی طرف اشارہ۔

نظموں کے مطالعہ سےحضرت اختؔر کی شاعرانہ مہارت وعظمت میں کسی کمی کا احساس پیدا نہیں ہوتا، مگر سچی بات یہ ہے کہ شاعر کے محسوسات ومشاہدات وتجربات کی اصل جولاں گاہ غزل ہے یہ غزلیں عشقیہ یا ہوں، صوفیانہ ہوں یا ان کا سروکار عصری حسیت سے ہو۔ ان کی سادگی میں گل پیرہنی حزنیہ لہجے میں سرخوشی، نشاطیہ آہنگ میں رومانی غم انگیزی اور لفظوں کے پیچ وخم میں طنزیہ کاٹ کی آمیزش ہے۔ حضرت اختؔر کے صاف وشفاف اور بے داغ دل کی طرح ''پارۂ دل'' میں بھی ابہام ہے نہ پیچیدگی نہ ژولیدہ خیالی۔

ان غزلوں کا خالق بیک وقت عالم ہے اور عارف بھی اور راقم الحروف کی نگاہ میں خانوادۂ اشرفیہ کی سب سے زیادہ محترم اور بابرکت شخصیت۔ دل ودماغ کی جمالیاتی آسودگی کے ساتھ ''پارۂ دل'' کا مطالعہ انشراح قلب اور تطہیر جذبات کا خوشگوار وسیلہ ہے۔

امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور خواص اسے بہ نظر استحسان دیکھیں گے۔

اختؔر تری غزلوں میں تابائی ہنر ہے
تم بھی ہو اک ستارے دنیائے اہل و فن کے
علیگڑھ

علامہ اختر بحیثیت نعت گو شاعر

سید حسن مثنیٰ انور

حمد، نعت اور منقبت تینوں الفاظ یوں تو مشترک المعنی ہیں یعنی سب تعریف وتوصیف ہی

کی نشاندہی کرتے ہیں البتہ علمائے دین وادب نے محل استعمال کو نسبت سے مقید کر رکھا ہے مثلاً جب تعریف و توصیف کی نسبت رب ذوالجلال کی طرف ہوگی تو اسے حمد کہیں گے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب ہوگی تو اسے نعت سمجھیں گے اور جب صحابہ، ولی یا کوئی باکمال بزرگ کی تعریف و توصیف کا مقصود ہوگا تو اسے منقبت سے تعبیر کریں گے۔

اس نسبتی فرق و امیاز نے اگر ایک طرف عقیدہ و نظریہ کی شدت وحدت کی حصار بندی کی ہے تو دوسری جانب طائر تخیل کو بھی پابند کر دیا ہے کہ وہ اپنی حد سے باہر پرواز نہ کرے۔

اصناف شاعری میں حمد، نعت اور منقبت کی کوئی مخصوص اور متعین ہئیت نہیں ہے۔ سارے اصناف شاعری میں ان سب کی جلوہ گری پائی جاتی ہے تاہم یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ حمد و نعت کی اصل پہچان صرف افکار و میلانات سے ہوتی ہے ان کا معتبر و مستند مآخذ کتاب و سنت ہے اور تاریخ و سیر ان کے لئے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ نعت کا محور و مرکز رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والاصفات ہے۔ یہ عظیم المرتبت ذات منصب نبوت و رسالت پر فائز ہے اور خالق و مخلوق کے درمیان کی وہ بنیادی کڑی ہے۔ جو مخلوق کو خالق سے ملاتی ہے۔ عارفوں کی زبان میں اس بنیادی کڑی کا دوسرا نام واسطۃ الفیض ہے اس اعتبار سے منصب نبوت و رسالت کے وہ اہم تقاضے سامنے آتے ہیں۔ اول خالق سے اس کے احکام و فرامین کو حاصل کرنا دوم انھیں مخلوق کو ارسال کرنا اور اپنی ذات کو انکا نمونۂ عمل بنانا۔۔۔۔ ذرا غور کیجئے کہ ایسی باعظمت اور بے مثل شخصیت کی مدح و ستائش کس قدر دشوار ہے جہاں فکری اور لسانی دونوں لحاظ سے افراط و تفریط کی کوئی گنجائش نہیں! افراط میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اس واسطۃ الفیض کو خدانخواستہ کوئی خدا نہ سمجھے اور تفریط میں یہ دھڑکن رہتی ہے کہ کہیں اسے کوئی اپنی طرح نہ سمجھنے لگے! اسی لئے نعتیہ شاعری کے لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی نزاکت و سنگینی کا احساس عرفی شیرازی کو ہوا تو بول پڑا:

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا ست

آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

بیدل جیسے قادر الکلام شاعر نے بھی بے ساختہ کہہ دیا:

زلاف حمد ونعت اولیٰ ست برخاک ادب خفتن
سجودی تواں کردن درودے می تواں گفتن

جب ہم نعت کے سلسلہ نورانی کی ابتدا تلاش کرتے ہیں تو ہمارے سامنے وہ پہلا منظر آتا ہے جب خالق کائنات نے اپنے محبوب کے نور کی تخلیق کی اور اعزاز نبوت سے سرفراز کیا اور عالم ارواح ہی میں تمام انبیاء ومرسلین کی روحوں سے اپنے ربوبیت کاملہ کا عہد لیا اور اسی کے ساتھ یہ اقرار بھی کہ اس نور اول کی اپنے اپنے عہد میں آنے کی بشارت دینا، فضیلت بیان کرنا اور مدد پہونچانا۔۔۔۔۔۔۔۔اسی عہد میثاق نے حمد ونعت کی داغ بیل ڈالی ہے، دوسرا منظر وہ ہے کہ رب کائنات نے اسی نور اول سے سارے جہانوں کی تخلیق فرمائی اور سیدنا آدم علیہ السلام کی پشت مبارک میں اس نور کو رکھ سارے ملائکہ کو حکم دیا کہ اب آدم کا سجدۂ تعظیمی کرو! عارفوں کا کہنا ہے کہ حضرت آدم کی تعظیم وتوقیر اور ان کا مسجود ملائک ہونا اسی نور اول کی جلوہ گری کی بدولت تھا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت نے مجموعہ قصائد میں کیا خوب فرماتے ہیں۔ یہاں صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

۱) آپ کی وہ مقدس ذات ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ہرگز کوئی آدمی پیدا نہ ہوتا اور نہ کوئی مخلوق پیدا ہوتی۔

۲) آپ وہ ہیں کہ آپ کے نور سے چاند کو روشنی حاصل ہے اور آفتاب آپ ہی کے نور سے منور ہے

۳) آپ وہ ہیں کہ جب آدم نے لغزش کے سبب آپ کا وسیلہ پایا تو وہ کامیاب ہو گئے حالانکہ وہ آپ کے باپ ہیں

۴) آپ ہی کے سیلہ سے (حضرت) خلیل نے دعا مانگی تو آپ کے روشن نور سے آگ ٹھنڈی

ہوگئی

۵)اور حضرت ایوب نے اپنی مصیبت میں آپ ہی کو پکارا تو اس کے باعث ان کی مصیبت دور ہوگئی۔

۶)اور (حضرت) مسیح آپ ہی کی بشارت اور صفات حسنہ کی خبر دیتے ہوئے آئے

۷)اسی طرح (حضرت) موسیٰ آپ کا وسیلہ اختیار کرنے والے اور قیامت میں آپ کے سبزہ زار میں پناہ لینے والے ہیں۔

۸)اور انبیا و تمام مخلوقات میں ہر مخلوق ،رسول، ملائکہ آپ کے جھنڈے کے نیچے ہونگے

انھیں خیالات و افکار کو مولانا جامی نے اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کیا ہے

وصلی اللہ علی نور کزد شد نورہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق اوشیدا
محمد احمد و محمود دے را خالقش بستود
کزد شد بود ہر موجود زد شد دیدہا بینا
اگر نام محمد رانیا وردے شفیع آدم
نہ آدم یافتے توبہ نہ نوح از غرق نجینا
نہ ایوب از بلا راحت نہ یوسف حشمت وجاہت
نہ عیسیٰ آن میسحا دم نہ موسی آن ید بیضا

اس طور سے صنف نع نے اپنی پہلی ارتقائی منزل طئے کی۔ اس پہلی منزل یعنی عالم ارواح میں رب کائنات ،ملائکہ اور انبیاء و مرسلین سب ہی نعت نور محمدی کا نمونہ پیش کیا اور جب وہی نور اول جامۂ بشری میں اس جہانِ خاکی کی اصلاح وترتیب کی خاطر بھیجا گیا تو رسول عربی ﷺ کی صورت میں نمودار ہوا آپ نے ۴۰ سالہ زندگی خاموشی کے ساتھ ذکر وفکر اور عبادت و ریاضت میں گزاری اور سب کی نگاہوں میں امین و صادق رہے۔ پھر آپ نے اعلان نبوت فرمایا اور نزول وحیٔ الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا۔ دور جاہلیت کے ادب کو دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ عربی زبان کا جاہ وجلال اور کروفر کا احساس

نمایاں طور پر چھایا ہوا ہے۔ قصیدہ نگاری کا عام مذاق تھا قبائلی رنجش، آپسی چپلقش، سماجی انتشار وافتراق نیز باہمی جنگ و جدال شاعری کے مخصوص موضوعات تھے۔ قرآنی اسلوب بے فکری اور لسانی دونوں اعتبار سے عربی زبان وادب کو متاثر کیا۔ اب طلوع اسلام کے بعد ایک طرف مشرکین مکہ اپنے عقائد میں پیغمبر اسلام کے خلاف سبک روی کی راہ اختیار کرنے لگے اور دوسری جانب اسلام پسندوں نے ان کی آوارہ خیالی کا منظوم جواب دینے کے ساتھ اسلام کی صداقت اور نبی ﷺ کے اوصاف جلیلہ اور اخلاق حمیدہ کو نمایاں کرنے میں لگ گئے، ۔ اسی فکری آویزش نے بھی نعت کے فن کو خاص جلا بخشی اور عربی ادب میں پیغمبر اسلام کے تعلق سے صدق مقال۔ حسن کردار، صفت حیا۔ عدل وانصاف اور خلق عظیم کے مضامین شامل ہوئے، شعرائے عرب میں خلفائے راشدین اور آئمۂ اہل بیت کی شمولیت کے ساتھ حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ، کعب بن زبیر، وغیرہ کے اسمائے گرمی روز روشن کی طرح چمک رہے ہیں۔ حسان بن ثابت کا یہ ارشاد گرامی کہ ”اپنے حسن کلام سے خدا کے محبوب کو زینت مت دو بلکہ محبوب خدا کے حسن و جمال سے اپنے کلام کو سنوارو“ آج بھی نعتیہ شاعری کے ضابطۂ فن کی شرط اول ہے علاوہ ازیں نزول قرآن کے تسلسل نے اگر ایک جانب رب ذوالجلال کی الہیت والوہیت کو بے نقاب کیا تو دوسری جانب محبوب کردگار کی سیرت و شخصیت کے ایسے نادر ونایاب پہلو اجاگر کئے

جس کی مثال گزشتہ کسی صحف آسمانی میں نہیں ملتی۔ قرآن حکیم نے انبیا علیہم السلام کا نام لیکر عام طور پر مخاطب کیا ہے۔ مثلاً

یا آدم یا نوح، یا موسیٰ، یا عیسیٰ وغیرہ

مگر جب اپنے محبوب ﷺ کو مخاطب فرمایا تو اس انداز سے:

یاایھاالنبی، یاایھاالرسول، یاایھاالمزمل، یاایھاالمدثر، طٰہٰ، یٰسین، وغیرہٗ

اور جب کبھی نام لینا ضروری ہوا تو کسی نہ کسی وصف کے ساتھ مربوط کردیا مثلاً

وما محمد الا رسول (آل عمران ع ۱۵)

محمد رسول اللہ (فتح ع ۴

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شئ علیما (احزاب ع ۵)

اسی طرح رب تعالیٰ نے ممانعت فرمادی کہ کوئی اس کے محبوب کا نام لیکر نہ پکارے

لاتجعلو دعاء الرسول بینکم کدعا بعضکم بعضا (نور ع ۹)

انتہا یہ ہے کہ رب تبارک وتعالیٰ نے اپنے اسم گرامی کے ساتھ اپنے محبوب ترین رسول کو بھی شریک کیا ہے

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسل واولی الامر منکم (نساء، ع ۹۸

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ۰ (انفال، ع ۳)

ومن یطعر اللہ ورسولہ (نساء۔ ع ۲)

قل الانفال للہ والرسول (انفال ع ابتدائی)

اسی پر بس نہیں نلکہ اللہ جل شانہ نے اپنے کلام مقدس (قرآن حکیم) مین اپنے محبوب کا خلق عظیم، صبر وشکر، عفوودرگزر، وسعت علم، شفقت ورحمت، سخاوت وایثار، عزم واستقلال، قوت وشجاعت، صدق وصفا، عفت وحیا، عدل وانصاف، ذوق عبادت اور مقام قرب خاص کا صراحت کے ساتھ ذکر فرمایاے۔ اس غایت درجہ کی محبت وشفقت دلیل کی حیثیت رکھتی ہے کہ رب کائنات نے اپنے محبوب ﷺ کی بطور خاص ثنا خوانی کی ہے تاکہ بشری عقل ودانش کے لئے نعت نگاری کے رہنما اصول بنائے جاسکیں

جب اسلام عرب سے چل کر عجم میں داخل ہوا تو اس کو سب سے پہلے ایرانی تہذیب وثقافت کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآنی اسلوب فکر اور طرز نگارش نے فارسی شعرا کو حد درجہ متاثر کیا۔ چنانچہ صنف نعت کے مذکورہ رہنما اصولوں کی روش پر فارسی شعرا نے فکر قرآنی کو محاسن شعر میں ڈھال کر نعت کے فن

کو عروج بخشا۔ اس ضمن میں فردوسی، رودکی، سعدی، حافظ، مولانا روم، جامی، خاقانی، قاآنی، نظامی، عرفی، عطار دوغیرہم کے اسمائے گرامی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں

جب نعت گوئی کی صنف براہ فارسی اردو زبان کے اقلیم میں پہونچی تو ہندوستان کی آب وہوا میں اس کے پھلنے پھولنے کے بہتر مواقع میسر آئے، یوں تو یہاں بھی پہلے فارسی زبان میں ہی شعر گوئی کا چلن تھا لیکن بعد میں جب اردو زبان نے اپنے بال وپر نکالے تو دیگر اصناف سخن کی طرح نعت نگاری کا فن بھی اردو زبان میں گھل مل گیا گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں میں اس فن کی بڑی پذیرائی ہوئی پھر جب اس فن نے دکن سے شمال ہند کی طرف رخ کیا تو پہلے خانقاہوں میں اس کی آؤ بھگت ہوتی رہی۔ بعدہ یہاں سے بن سنور کے یہ فن حلقۂ دانشوراں میں پہونچا اور اس کی مقبولیت اس حد تک بڑھ گئی کہ شعرا نے اپنی نجات وعاقبت اور قلبی وذہنی امن وسکون کی خاطر اس فن کے تقدس میں چار چاند لگا دیئے۔

نعت نگاری میں تصوف کے مضامین کو شامل کیا، عشق رسول کو فروغ دیا، محبوب رب جلیل وجمیل کے خصائص کبریٰ اور فضائل عظمیٰ کے ساتھ پرنور سراپا کھینچا۔ ان کی جلوت، ان کی خلوت، ان کا اٹھنا، انکا بیٹھنا، سونا، جاگنا، چلنا، پھرنا، سب کو موضوع سخن بنایا، کمال اخلاص ومحبت، وفور عقیدت، عاجزی، وفروتنی اور وارفتگی وسپردگی کے احساس فرداں کے ساتھ صنف نعت کی معنوی توسیع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوچنے سمجھنے کے پیمانے بدلیا سالیب بنای کی سمتیں متعین ہوئیں۔ لفظوں کے رموز وعلائم نے نئی شکلیں اختیار کیں۔ نادر استعارے اور تازہ دم تشبیہوں نے زبان کی رمزیت کو اجاگر کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ میرؔ، سوداؔ، میر دردؔ، مرزا جان جاناںؔ، غالبؔ، ظفرؔ، اقبالؔ، محسنؔ کاکوروی، امیرؔ مینائی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، حسنؔ بریلوی، مولانا آسیؔ غازیپوری، سید علی حسن احسنؔ جائسی، مولانا سید علی حسین اشرفیؔ کچھوچھوی، مولانا حکیم سید نذر اشرف فاضلؔ کچھوچھوی، مولانا سید محمد

محدث کچھوچھوی وغیرہم کی مساعی جمیلہ رنگارنگی نے اصناف سخن میں خصوصیت کے ساتھ نعت نگاری کی ایک کہکشاں بنائی جس کی آب وتاب آسمان شعروادب پر پھیلی ہوئی ہے۔

اسی تاریخی پس منظر میں ’’باران رحمت‘‘ کامطالعہ کیجئے جوایک مجموعۂ نعت ومنقبت ہے اور مولانا سید محمد مدنی اخترؔ کچھوچھوی کی تخلیق ہے مولانا کو شاعری ورثے میں ملی ہے، وہ ایک ہی وقت میں منقولات ومعقولات پر کامل دسترس رکھنے والے عالم بھی ہیں۔ بین الاقوامی سطح کے خطیب بھی ہیں تفقہ میں منفرد بھی ہیں مسند رشد وہدیت کی زینت بھی ہیں اور معتبر ادیب وشاعر بھی ہیں۔ مولانا کی درجنوں تصانیف اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ’’باران رحمت‘‘ کے نام سے پہلی بار منصۂ شہود پر آرہا ہے، میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ مولانا موروثی شاعر ہیں۔ ان سے پہلے ان کے والد گرامی محدث اعظم ہند مولانا ابوالمحامد سید محمد اشرفی الجیلانی (المتوفی ۲۵ دسمبر ۱۹۶۱؁) کا مجموعۂ کلام ’’فرش پر عرش‘‘ طبع ہو کر ملک و بیرون ملک میں پھیل چکا ہے۔ مولانا کے دادا مولانا حکیم سید نذر اشرف فاضل کچھوچھوی (المتوفی ۲۱ نومبر ۱۹۳۹؁ء) اپنے وقت کے زبردست عالم ودانشور تھے فن طبابت وحکمت میں ان کا وجود لاثانی تھا۔ شعروادب میں بھی غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے ان کی زندگی کا بڑا حصہ جائس ضلع رائے بریلی کے علمی وادبی ماحول میں گزرا، انہوں نے اپنے حقیقی ماموں مولانا سید علی حسن احسنؔ جائسی سے اکتساب علم وفن کیا، دلی کے قیام کے دوران داغ دہلوی سے بھی زبان وبیان کا ہنر سیکھا۔ کچھوچھا شریف میں علمی وادبی انجمن آرائی ان ہی کی مرہون منت رہی ہے۔

افسوس صد افسوس اس بات پر ہے کہ ان کا شعری سرمایہ محفوظ نہ رہ سکا۔ جس کے ہاتھ لگا وہ مالک بن بیٹھا۔ یہاں ان کے کلام کی چند جھلکیاں پیش کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو؛

کرم سب پر ہے کوئی ہو کہیں ہو
تم ایسے رحمت اللعالمیں ہو

شریک عیش و عشرت سب ہیں لیکن
مصیبت کاٹنے والے تمہیں ہو

☆☆☆

عروج کی شب عجیب شب تھی عجب جلو تھا عجب سماں تھا
زمیں تھی ساکت، پہاڑ بے حس، عجیب چکر میں آسماں تھا
ستارے باہم تھے نورافشاں فلک کا ہر حصہ تھا چراغاں
جہاں میں ذرے چمک رہے تھے زمیں کا ہر گوشہ کہکشاں تھا
محب و محبوب کی تجلی سے سب حجابات اٹھ گئے تھے
عجب تماشہ تھا چار جانب عیاں نہاں تھا نہاں عیاں تھا

حضرت فاضل کا رنگ تغزل بھی دیکھئے:

موسم گل کو کیا کروں دل ہی نہیں قرار میں
زخم جگر ہرے ہوئے آگ لگے بہار میں

ان کا عارفانہ طرز سخن بھی ملاحظہ ہو

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدارمی رقصم
مگر نازم بریں ذوقے کہ پیش یارمی رقصم
نگاہش جانب من چشم من محو تماشایش
منم دیوانہ لیکن بادل ہشیارمی رقصم
زہے رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را
خوشا تقویٰ کہ من باجبّ و دستارمی رقصم

بیا جاناں تماشہ کن کہ در انبوہ جانبازاں
بصد سامان رسوائی سر بازاری رقصم
تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون خونخواری رقصم
برائے شعلہ می رقصم تپش چوں حالتی آرد
خلش چوں لذتی بخشد بنوک خاری رقصم
زہے رنگ تماشایش خوشا ذوق دلم فاضلؔ
کہ می بیند چوں او یکبار من صدباری رقصم

(ماخوذ از رسالہ اشرفی بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء)

حضرت فاضلؔ کچھوچھوی کے اور بھی اشعار ہیں ان کی منقبت بھی ملی نظم ہے اور منظوم ترجمے بھی ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے اس مختصر تحریر سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جس علمی وادبی اور دینی ماحول میں مولانا سید محمد مدنی اخترؔ کچھوچھوی نے آنکھیں کھولی ہیں اور ذہنی تربیت حاصل کی ہیں وہ ہمیشہ ایک غیر معمولی اہمیت وافادیت کا حامل رہا ہے

بہر حال باران رحمت کا آغاز حمد الٰہی کے ان چار مصرعوں سے ہوتا ہے

ذرے ذرے سے نمایاں ہے مگر پنہاں ہے
میرے معبود! تیری پردہ نشینی ہے عجیب
دور اتنا کہ تخیل کی رسائی ہے محال
اور قربت کا یہ عالم کہ رگِ جاں سے قریب

ان چار مصرعوں میں کتاب اللہ کی جلوہ گری ہے اور ونحن اقرب من حبل الورید کی صدائے ربانی کی گونج سنائی دیتی ہے،، مولانا اخترؔ کچھوچھوی کے تخلیق ذہن نے اس حقیقت مطلقہ کی معرفت کرائی ہے جو مستور بھی ہے اور نمایاں بھیبعید تر بھی ہے اور قریب تر بھ۔ مزید برآں اس کی پردہ نشینی عقل انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔ اسی فکری کشمکش سے مولانا آسی غازیپوری کو بھی

دو چار ہونا پڑا تھا، ملاحضہ ہو:

بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ سے جلوہ آشکار
اس پر یہ گھونگھٹ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

مگر مولانا اختر کچھوچھوی کا رنگ دوسرا ہے۔ وہ اپنے معبود کو مخاطب کرتے ہیں کمال ادب کے اور حیرت واستعجاب کا اظہار کر کے گویا جاننا چاہتے ہیں کہ اس پردہ نشینی کے دو مختلف مظاہر والوان کا راز کیا ہے! اس لحاظ سے مولانا کا فکری ارتقاع سے ایک جداگانہ انفرادیت رکھتا ہے۔ اور اسلوب بیان کی سادگی و پرکاری نے اسے غیر معمولی جلا بخشا ہے ان چار مصرعوں کو اگر شرعت وشاعری کے امتزاج کا ایک حسین نمونہ کہا جائے تو شاید نامناسب نہ ہوگا!

حمد باری تعالیٰ کا دوسرا خوبصورت نمونہ ایک نظم میں بھی پایا جاتا ہے جو اظہار تشکر کے عنوان سے باران رحمت میں شامل ہے، ملاحظہ ہو:

اے خدا شکر ترا، شکر ترا، شکر ترا

خاک بے مایہ سے انسان بنایا مجھ کو
زیور دانش و حکمت سے سجایا مجھ کو
نقش پائے شہ عالم پہ چلایا مجھ کو

اے خدا شکر ترا، شکر ترا، شکر ترا

ساقیٔ کوثر وتسنیم کا میخوار کیا
بدۂ حب نبی سے مجھے سرشار کیا
دل تاریک کو رشک مہ ضوبار کیا

اے خدا شکر ترا، شکر ترا شکر ترا

ماندگی مجھ میں جو پاتی ہے عنایت تیری
سرمۂ نیند لگاتی ہے عنایت تیری
میرا دکھ درد مٹاتی ہے عنایت تیری

اے خدا شکر ترا، شکر ترا شکر ترا

مذکورہ نظم میں ہر بند کی پیشانی پر ”اے خدا شکر ترا، شکر ترا شکر ترا“ کی تکرار کے ساتھ رب ذوالجلال کے فضل بے پایاں، رحمت بے کراں، اور الطاف فرداں کے جو نقش و نگار پیش کئے گئے ہیں وہ شاعری کے عارفانہ بصیرت اور دینی شعور کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ کیا عجب مولانا اختؔر کچھوچھوی کے ذہن رسا نے صنعت تکرا کا یہ دلربا انداز قرآن حکیم کی سورہ رحمٰن سے مستعار لیا ہو جہاں ”فبای الاء ربکما تکذبان“ کی تکرار کے ساتھ رب تعالیٰ اپنے فضل و کرم، انعام و اکرام اور داد دہش کی رنگارنگی کو شمار کراتا ہے۔ یہ فرق ضرور ہے ایک جگہ نعمت کے ذکر کے بعد ’فبای الاء ربکما تکذبان کی تکرار سے اصلاحی طور پر کریدنے اور جھنجھوڑنے کا اہتمام ہے اور دوسری جگہ نعمتوں کے حسول کا اعتراف و اقرار ہے اور بارگاہ رب العزت میں جذبہ احسان مندی لئے سر نیاز جھکانے کی ادا ہے۔ چنانچہ دونوں جگہ لذت تکرار نے کلام کی معنویت میں دل کشی پیدا کردی ہے

مولانا اختؔر کچھوچھوی کی نعتیہ شاعری اپنی انفرادی شان رکھتی ہے ان کی شاعرانہ طبیعت کا مرکز و محور ”عشق رسول“ ہے وہ کامل ایمان و ایقان کے ساتھ اپنے مرکز شعری سے والہانہ تعلق خاطر رکھتے ہین ان کی نظر میں محمد رسول اللہ دلیل لاالہ الااللہ ہیں لہٰذا دلیل کو سمجھنے اور ماننے بغیر دعویٰ کی تفہیم ممکن ہی نہیں ہے بقول اقبال:

بمصطفٰی برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست

اگر باد نرسیدی تمام بو لہبی ست

(ارمغان حجاز)

یہی وجہ ہے کہ وہ اس دلیل کے گرد گھومتے رہتے ہیں اور فکری مواد حاصل کرتے ہیں کتاب وسنت سے ان کی وابستگی اس دلیل کی بوقلمونی کو مزید نمایاں کرتی ہے۔ ان کی ایک نعت ملاحظہ ہو؛

خدائے و برتر بالا ہمیں پتہ کیا ہے
ترے حبیب مکرم کا مرتبہ کیا ہے
جبین حضرت جبرئی پر کف پا ہے
ہے ابتدا کا یہ عالم تو انتہا کیا ہے
خدا کی شان جلال و جمال کے مظہر
ہر ایک سمت ہے تو ہی ترے سوا کیا ہے
کوئی بلال سے پوچھے خبیب سے سمجھے
خمارِ الفتِ محبوب کبریا کیا ہے
سمجھ لو عہد رسالت کے جاں نثاروں سے
کامل صدق و صفارشتۂ وفا کیا ہے
بشر کے بھیس میں لاک البشر کی شان رہی
یہ معجزہ جو نہیں ہے تو معجزہ کیا ہے
غم فراق نبی میں جو آنکھ سے نکلے
خداہی جانے ان اشکوں کا مرتبہ کیا ہے
کرم کرم کہ کریمی ہی شان ہے تیری
ترے کرم کے مقابل مری خطا کیا ہے
جو میری جان سے زیادہ قریب ہیں مجھ سے
انھیں کو ڈھونڈ رہاہوں مجھے ہوا کیا ہے
فقط تمہاری شفاعت کا آسرا ہے حضور
ہمارے پاس گناہوں کے ماسوا کیا ہے

چلو دیارِ مدینہ جو دیکھنا چاہو
زمیں سے عرشِ معلی کا فاصلہ کیا ہے
بخاری پڑھ کے بھی شان محمدعربی
سمجھ نہ پائے اگر تم تو پڑھا کیا ہے
وہ دیکھو گنبدِ خضریٰ ہے رو برو تیرے
نثار کردے دل و جان دیکھتا کیا ہے
کھڑا ہے اخترؔ عاصی درِ مقدس پر
حضور آپ کی رحمت کا فیصلہ کیا ہے

اس موقع پر مولانا کی دوسری نعت بھی پیش کی جاتی ہے جو فکروفن کے امتزاج کا حسین مرقع ہے؛

اس دیار قدس میں لازم ہے اے دل احتیاط
بے ادب ہیں کر نہیں پاتے جو غافل احتیاط
جی میں آتا ہے لپٹ جاؤں مزار پاک سے
کیا کروں ہے میرے ارمانوں کی قاتل احتیاط
اضطران عشق کا اظہارر ہو بے حرف و صوت
اے غم دل احتیاط اے وحشت دل احتیاط
عشق کی خود ورفگی بھی حسن سے کچھ کم نہیں
ہے مگر اس حسن کے رخسار کا تل احتیاط
ان کے دامن تک پہونچ جائیں نہ چھینٹیں خون کے
ہے تڑپنے میں بھی لازم مرغ بسمل احتیاط
آ بتاؤں تجھ کو میں ارشاد او ادنیٰ کا راز
ان کے ذکر قرب میں لازم ہے کا مل احتیاط
صرف سدرہ تک رفاقت اور پھر عذر لطیف
عقل والو ہے ادائے عقل کامل احتیاط

بس اسی کو ہے ثنائے مصطفی لکھنے کا حق
جس قلم کی روشنائی میں ہو شامل احتیاط
نام پر توحید کے انکار تعظیم رسول
کیا غضب ہے کفر کو کہتے ہیں جاہل احتیاط
اس ادب نا آشنا ماحول میں اختؔر کہیں
رہ نہ جائے ہو کے مثل حرف باطل احتیاط

مذکورہ بالا دونوں نعتوں میں فکر کی جولانی، جذبہ کا کڑھاؤ، فنی چابکدستی کتاب وسنت سے ممارست سب مل کر اسی ایک سرچشمہ حیات کی نشاندہی کرتے ہیں جس کا نام ''عشق رسول'' ہے اسی عشق کے نقش ہائے رنگ رنگ ان اشعار میں بھی دیکھئے:

بڑے لطیف ہیں نازک سے گھر میں رہتے ہیں
میرے حضور میری چشم تر میں رہتے ہیں
یہ واقعہ ہے لباس بشر بھی دھوکا ہے
یہ معجزہ ہے لباس بشر میں رہتے ہیں
خداکے نور کو اپنی طرح سمجھتے ہیں
یہ کون لوگ ہیں کس کے اثر میں رہتے ہیں
حسن خورشید نہ مہتاب کا جلوہ دیکھو
آؤ احمد کے کفِ پا کا تماشہ دیکھو
دیکھنے والو دیارِ شہِ بطحا دیکھو
فرش کی گود میں ہے عرش معلی دیکھو
سوچتاہوں کیا کہوں میں، کیا نظر آنے لگا
وہ ریاض برزخ کبریٰ نظر آنے لگا
آنکھ جب تک بند تھی اک آدمی سمجھا تجھے
اور جب وا ہو گئی کیا کیا نظر آنے لگا
ان کی یادوں میں جو ٹپکا اشک اختؔر آنکھ سے

منزلت میں عرش کا تارہ نظر آنے لگا
اے حسین بن علی تیری شہادت کو سلام
دین حق اب نہ کسی دور میں تنہا ہوگا
رب نے چاہا تو قیامت میں سبھی دیکھیں گے
ان کے قدموں میں پڑا اخترؔ خستہ ہوگا

وہ مری جان بھی جان کی جان بھی میرا ایمان بھی روح ایمان بھی
مہبط آیات قرآن بھی اور قرآن بھی روح قرآن بھی
نور و بشریٰ کا یہ امتزاج حسیں جیسے انگشتری میں چمکتا نگیں
عالم نور میں نور رحمٰن بھی عالم انس میں پیک انسان بھی

اس روئے والضحیٰ کی صفا کچھ نہ پوچھئے
آئینہ جمال خدا کچھ نہ پوچھئے
قوسین پر وہ نور اونیٰ میں چھپ گئے
پھر کیا ہوا ہوا جو ہوا کچھ نہ پوچھئے

☆☆☆☆

ذکر جہاں میں ہم سب پڑ کر کیوں ضائع لمحات کریں
آؤ پڑھیں والشمس کی سورت روئے نبی کی بات کریں
نور خدا ہے نور نبی ہے نور ہے دیں اور نور کتاب
ہم ایسے روشن قسمت کیوں تاریکی کی بات کریں
یہ لذات کی دنیا کب تک؟ اس کی اسیری ٹھیک نہیں
آؤ سمجھ سے کام لیں اخترؔ خود کو طالب ذات کریں

☆☆☆☆

روشن زمیں ہوئی تو حسیں آسماں ہوا
نور رخِ نبی سے منور جہاں ہوا
کیا خوب ہے کمال تصرف کی یہ مثال
پروردۂ نبی پہ خدا کا گماں ہوا
نعت رسول آیۂ رحمت کا ہے کرم
میں ہم زبانِ انجمن قدسیاں ہوا
صرف اتنا ہی نہیں غم سے رہائی مل جائے
وہ جو مل جائیں تو پھر ساری خدائی مل جائے
میں یہ سمجھوں گا مجھے دولت کونین ملی
راہ طیبہ کی اگر آبلہ پائی مل جائے
سرمژگاں پہ کچھ سیال موتی جگمگاتے ہیں
اسے میں روشنی ان کی کہوں یا روشنی اپنی

مولانا اختر کچھوچھوی نے ۱۱۲ اشعار پر مشتمل ایک ساقی نامہ بھی لکھا ہے جس کا مطلع ہے:

تمہاری آمد لئے ہوئے ہے نوید صبح بہار ساقی
گلوں کے لب پہ ہے مسکراہٹ غریق شادی ہیں خار ساقی

یہاں ساقی سے مراد محبوب رب ذوالجلال کی ذات والا صفات ہے۔ یہ مولانا نے محاسن شعری کے ساتھ اپنے قلبی واردات کو پیش کرتے ہوئے حضور آیۂ رحمت ﷺ کی معجزانہ شخصیت کے کئی نادر پہلوؤں کو زینت قرطاس بنایا ہے۔

اگر پلک کو ہو ایک جنبش تو ڈوبتا مہر لوٹ آئے
ترے اشارے پہ ہے نچھاور یہ دور لیل و نہار ساقی
سنا ہے دارسنان ابرو تراش دیتا ہے انگلیوں کو

مگر تری جنبش نظر پہ سردوعالم نثار ساقی
لرز اٹھے تار عنکبوتی کے مثل ایوان باطل
تری صدا ہے قسم خدا کی صدائے پروردگار ساقی
اگر نگاہ کرم اٹھے تو گناہ گاروں کی بھی بن آئے
خدا نے بخشا ہے تجھ کو سارے جہان کا اختیار ساقی

بڑی فرض ناسناشی ہوگی اگر مولانا اختر کچھوچھوی کی اس نعت کا ذکر نہ کیا جائے جس کا مطلع ہے:

ساقیٔ کوثر مراجب میر میخانہ بنا
چاند و سورج خم بنے ہر نجم پیمانہ بنا

اسی نعت کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اللہ اللہ رفعت اشک غم ہجر نبی
جونہی ٹپکا آنکھ سے تسبیح کا دانہ بنا
آج بھی سورج پلٹ سکتا ہے تیرے واسطے
اپنے دل کو الفت احمد کا کاشانہ بنا
چاند کی رفعت کو چھو لینا کہاں کی عقل ہے
عقل یہ ہے چاند کو خود اپنا دیوانہ بنا
جانے کتنی ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا ہوں میں
مجھ کو محروم تمنا میرے مولیٰ نہ بنا
دھو کے اپنے نطق کو مدح نبی کے آب سے
اپنی ہر ہر بات اے اختر حکیمانہ بنا

مذکورہ بالا نعت عقیدہ کی پختگی، عشق رسول سے کامل وابستگی، فروتنی وخودسپردگی اور عصری میلان کا شدید احساس دلاتی ہے اپنی ہر بات حکیمانہ بنانے کا گر بھی اس نعت میں بتایا گیا ہے۔ ابلاغ

وترسیل کا ہنر ہمدوش قلب ونظر ہونے کے سبب ایسی ادبی فضا قائم کئے ہوئے ہے جہاں حسن و لطافت بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔

باران رحمت میں تاریخ وسن نہ ہونے کے باعث یہ اندازہ لگانا ذرا دشوار لگتا ہے کہ مولانا اختؔر کچھوچھوی کے تخلیق ذہن کا ارتقائی منازل کی نشاندہی کی جائے تاہم ایخ خاصہ حصہ ان کے نعتیہ کلام میں ایسا ہے جو ان کے ابتدائی نقوش شاعری کی اپنے اندرونی شواہد کی بنا پر گواہی دیتا ہے اگر اسے ابتدائی نقوش کے عنوان سے علیحدہ شامل کر دیا جائے تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔

باران رحمت میں چند منقبیں بھی ہیں تضمین بھی ہے اور متفرق اشعار بھی ہیں ان سب میں حزم و احتیاط، حسن عقدت، فکر کا بانکپن، جذبہ کی حرارت، لفظ و بیان کی تہہ دار معنویت اور مواعظ حسنہ کی دلکشی سب کچھ موجود ہے۔ مولانا اختر کچھوچھوی کے مواعظ حسنہ کے تعلق سے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے:

بجھ گئی عشق کی آگ اندھیر ہے وہ حرارت گئی وہ شرارہ گیا
دعوت حسن کردار بے سود ہے تھا جو حسن عمل کا سہارا گیا
جس میں پاس شریعت نہ خوف خدا وہ رہا کیا رہا وہ گیا کیا گیا
ایک تصویر تھی جو مٹا دی گئی یہ غلط ہے مسلمان مارا گیا
مرکے طیبہ میں اختؔر یہ ظاہر ہوا کچھ نہیں فرش سے عرش کا فاصلہ
گود میں لے لیا رفعت عرش نے قبر میں جس گھڑی میں اتار گیا

شعر وادب کے اس معیار وامتیاز کے باوجود مولانا اختؔر کچھوچھوی کا یہ ارشاد محل نظر ہے کہ

میرے اشعار کو میزان فن پر تولنے والو
فقط دل کی تسلی کے لئے ہے شاعری اپنی

حالانکہ سچائی یہ ہے کہ مولانا کے عزیز واحباب ان کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی منکسر المزاجی کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ادبی ماحول کی رنگا رنگی میں ان کی خلوت پسند فطرت سادہ کو خوب سمجھتے ہیں! پروفیسر رشید احمد صیقی کے الفاظ میں ’’یہ وہ حیا اور احتیاط ہے جس کو اسلام میں

ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے اور شرفائے ادب کا بڑا امتیاز ہے" مکتوب بنام پروفیسر اسلوب احمد انصاری (مشمولہ آئینہ خانے صفحہ ۱۲۸)

مجھے بیحد مسرت ہے کہ مولانا نے اپنی ادبی وراثت کو آگے بڑھایا ہے اور اس میں توانائی پیدا کی ہے۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ باران رحمت، حمد و نعت و منقبت کا ایک قابل قدر سرمایہ ہے جہاں شریعت، شعریے اور کلاسیکی ادب کی جگمگاہٹ کا باہمی امتزاج و اختلاط دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

امید کہ ارباب نقد و نظر اور قدر دان شعر و ادب اس کی یقیناً پذیرائی کریں گے
سید حسن مثنیٰ انور

الاشرف

برگد مثال اختر کچھوچھوی

غلام ربانی فدا

یوں تو ہر درخت جڑ، تنا، پتے، چھال اور پھل وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ حضرت اختر کی شاعری سے رابطہ ہونے کے بعد میں نے جب بھی برگد کے درخت کے بارے میں سوچا یا دیکھا تو مجھے

حضرت اختر کی شخصیت برگد کے ایک پیڑ کی مانند لگی۔ حضرت اختر کی ادبی قد آوری کی بات کی جائے تو برگد کا قد اس کا پھیلاؤ اور عاجزانہ جھکاؤ ان پر صد فی صد منطبق ہوتا ہے۔ جب ان کی ادب پروری اور اپنے جونیئرز کے ساتھ پیار بھرے رویئے اور حوصلہ افزائی کی بات کی جائے تو اس کی چھاؤں حضرت اختر کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ برگد کی چھاؤں کسی بھی اور درخت کی چھاؤں سے یوں بھی منفرد وممتاز ہے کہ اس کی چھاؤں میں کوئی چھید تک محسوس نہیں ہوتا۔ دھوپ کی حدت اس سے چھن کر بھی نیچے تک نہیں پہنچتی کہ پتے اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ دھوپ اپنی تمازت لئے اس کی چھتر چھاؤں کے اوپر ہی خیمہ زن رہتی ہے۔ برگد کی جڑ لکڑی چھال پتے شاخیں ہی نہیں اس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا دودھ بھی انسان کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ برگد کا ایک ایک ذرہ حیات بخش اور تسکین آفریں ہے۔ ہزارہا بیماریوں کا شافی علاج رب تعالی نے برگد میں سمو دیا ہے حضرت اختر نے کس کس صنف میں طبع آزمائی کی انہیں ہم استعارتی طور پر برگد کے حصوں سے جوڑ سکتے ہیں۔

بنظر غائر اگر ہم اردو ادب کے موجودہ دور کے مشاہیر پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ غزل گو شعراء نظم کے پیرائے میں اپنے اظہارِ خیال پر وہ گرفت کھو دیتے ہیں جو غزل کے اشعار میں ان کی انفرادیت اور خاصہ شمار کی جاتی ہے۔ اسی طرح نظم گو شعراء غزل کے میدان میں وہ شہسواری نہیں دکھا پاتے جو ان کا طرہ امتیاز ہوتی ہے۔ نتیجتاً وہ کسی ایک صنف تک محدود ہو جاتے ہیں۔

اگر تحقیق وتنقید کے میدان میں نظر دوڑائیں تو نقاد اور محقق صرف اسی صنف تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اچھے اچھے شعروں کی درگت بنا کر اور اچھے اچھے کلام کے بخیئے ادھیڑ کر انہوں نے شہرت کی بلندیاں حاصل کی ہوتیں ہیں اب اگر صاحب اسلوب شاعر یا مصنف کہلانا چاہتے ہوں تو انہیں نہایت عرق ریزی سے وہ کچھ تخلیق کرنا پڑتا ہے جس پر کم سے کم قلم رکھا جا سکے اور کم سے کم تنقید کا نشانہ بنے یہی وجہ ہے کہ ایسے نقاد اور محقق آپ کو ہزاروں مل جائیں گے۔ جن

کی تنقید و تحقیق پر بیسیوں کتابیں ہوں گی مگر اپنا کلام یا تخلیق ایک آدھ کتاب سے آگے نہ بڑھا ہو گا مگر ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو خود بھی بڑے تخلیق کار ہوں اور تنقید و تحقیق میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہوں۔ حضرت اختر انہی چند گنے چنے ناموں میں سے ایک ہیں جنہوں نے میں صرف کم عمری سے جو ادب و دین کی خدمت شروع کی تو آج تک پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہر لحظہ ہر ساعت نئی منزلیں تراشیں اور آنے والوں کے لئے مثالیں قائم کیں۔ حضرت اختر کو غیر تخلیقی رویوں نے ہی ہر دور میں چھلنی نہیں کیا بلکہ ادبی مذہبی زکوٰۃ پر پلنے والوں غیر سنجیدہ تخلیق کاروں نے ان کی راہ میں مخالفت و دشمنی کی کی رُکاوٹیں کھڑی کر کے انہیں سفر جاری رکھنے سے حتیٰ الامکان روکنے کی کوشش کی۔ مگر حضرت اختر تو برگد تھے۔ جسے ہر حال میں بڑھتے رہنا تھا۔ اور اپنا قد اونچا کر کے ہزاروں آنے والوں کے لئے چھاؤں مہیا کرنا تھی، لہٰذا مخالفین کی کوششیں یکسر رائیگاں ہوتی گئیں اور خلوص نیتی کی ایک بار پھر جیت ہوگئی۔ حضرت اختر نے اپنا سفر جاری رکھا کسی مخالف کی پرواہ کئے بغیر بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ دشمنوں کی دشمنی اور دوستوں کی دوستی کی پرواہ کیئے بغیر محوِ سفر رہے۔ دشمن تو مخالفت برائے مخالفت میں راہیں مسدود کرتے ہیں جبکہ دوست بے جا تعریف سے تخفیفِ سفر کا باعث بنتے ہیں۔ حضرت اختر ہر دو سے بچتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے اور آج اس مقام پر ہیں کہ انہیں رات کا چاند اور دن کا سورج کہا جا سکتا ہے۔ روشنی، نیکی اور محبت ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اور تا قیامت موجود رہیں گے۔ ان کی مخالفت میں ایک زمانہ ساز باز کر لے مگر ان کے ادبی و مذہبی کام کو مٹا دینا کبھی کسی کے بس میں نہیں رہا۔ روشنی کو اندھیرا کچھ وقت کے لئے اوجھل ضرور کر سکتا ہے مگر تا دیر اس کی راہ روکنا کبھی تیرگی کے بس میں نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ تیرگی کے لئے سمندر کو روشنی کی ایک کمزور کرن بھی پاٹ سکتی ہے۔ برائی نیکی کے سامنے ہر طور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور محبت نفرت کے مقابلے میں ناکام و نامراد ہوا ایسا نہ آج تک ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہوگا، ان کی طاقت ہمیشہ مسلّم رہی ہے۔ یہ تینوں چیزیں ہمیشہ حضرت اختر کے دائیں بائیں رہی ہیں بلکہ اگر یہ

کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت اختر کی ہر مخالف طاقت، ہر دشمنی کو زیر کرنے میں روشنی، نیکی، اور محبت ہی ہتھیار ثابت ہوئے ہیں۔ اور یہ تینوں ہتھیار جسے رب تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوئے ہوں۔ اس سا خوش نصیب تو پھر شاید ہی کوئی زمانے میں ہو۔

حضرت اختر کی شخیصت کے کتنے پہلوں نہ ہیں۔ مفسر، محدث، محقق، مفتی، مقرر، مدرس مفکر، شاعر، ادیب، صوفی، انشا پرداز، مصنف، مرتب،

صرف اور صرف کو جب ہم غزل کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو ان کے اشعار میں نیا پن نظر آتا ہے ان کی شاعری زندگی کے بہتر رویوں کی طرف اشارہ ہے حضرت اختر بد سے بدتر حالات سے مایوس نہیں ہیں جو کے انسان نے خود پیدا کئے ہیں بلکہ وہ اس امید سے بندھے ہیں کہ انسان کو کبھی نہ کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جانے پر انسانیت کی معراج کی طرف لوٹ آنا ہے، اسی کو وہ یوں بیان کرتے ہیں

مجھے معلوم ہے اے اشتراکیت کے فرزندو
حصار عافیت کے دعویٰ ہائے بے نشاں کب تک
ہے میری زندگی ویرانیوں کا منظر خستہ
مرے دم سے قفس صیاد کا آباد ہوتا ہے
گلہ کوئی بھی چیرہ دستیٔ صیاد سے کیا ہو
جہاں پر خود گل تر تیشۂ صیاد ہوتا ہے

حضرت اختر اپنے کلام کی روشنی میں ایک صوفی بھی ہیں جو روحانی طاقت کے دل سے قائل ہیں اور رب کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے اور نیکی کی قوت کو ہر جگہ کارفرما دیکھتے ہیں

رنگینیٔ مجاز حقیقت نما ہوئی
منزل پہ پہونچے سلسلہ عاشقی سے ہم

عشق کی اصطلاح میں ہمدم
موت کہتے ہیں مسکرانے کو
آنکھ ہے اشک باریوں کے لئے
دل ہے چوٹوں پہ چوٹ کھانے کے لئے

ہر شاعر کی طرح حضرت اختر بھی رومانیت پسند ہیں، انسانوں، چیزوں، مناظر اور رویوں میں خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں ان کی یہ شاعری پر اثر بھی ہے اور خوبصورت بھی۔

اک حسینہ سربازار بنی ہے رانی
دودھ سے چہرہ دھوتی ہے بجائے پانی
اس کی دنیا میں اندھیرے کا کوئی نام نہیں
اس کے ہاتھوں میں مصیبت کا کوئی جام نہیں

اسی طرح حضرت اختر کی شاعری میں جا بجا بوسیدہ نظام اور اس کے پروردہ آقاؤں کے خلاف ایک نفرت ایک احتجاج بھی ملے گا۔ یوں حضرت اختر نے بے خوفی سے جبر کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے اور معاشرتی ناہمواریوں خوب اظہار خیال کیا ہے۔

ایک فتویٰ جواز ویڈیو کے حوالے سے حضرت اختر نے دیا ہے جسے دین میں غیر ضروری طور پر متنازعہ فتوی بنادیا گیا۔ اس کے جزئیات واہمیت پر غور کئے بنا حضرت کے سادہ سے فتویٰ کو تختۂ مشق بنایا گیا۔ ان جواز و عدم جواز ان دو مباحث میں مکتب فکر کی خوبصورتی کو گہن لگنے کے ساتھ ساتھ اس پر جتنا کام ہونا تھا وہ بھی متاثر ہوا کوئی بھی محقق کبھی نہیں چاہتا کہ وہ نہایت عرق ریزی سے کوئی تحقیق منظر عام پر لائے مگر وہ اس کی نیک نامی اور شہرت میں اضافے کی بجائے محض ایک بحث کا موضوع بن کر رہ جائے۔ ایسے حالات میں چند سر پھرے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ اپنا

راستہ سنگلاخ چٹانیں تراش کر بناتے ہیں اور آسیبوں بھرے رستوں سے مردانہ وار ہر رکاوٹ کا مقابلہ کرتے ہوئے منزل پر پہنچنے کی خوشی ایک الگ ہی خوشی ہوتی ہے۔ اور ہر دور میں زیادہ نہیں تو چند لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اس خوشی سے سرشار ہو کر منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ حضرت اختر نے خود کو کبھی آسان راستے سے گزارنے کا گناہ نہیں کیا۔ حضرت اختر کے فتوی کی علمی حیثیت کی بحث ہو یا اس کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ موضوعِ سخن ہو ۔ حضرت اختر نے کسی سے پہلوتہی نہیں کی انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہر سوال کو سنا اور پھر برسوں کی محنت کے بعد اب تک ہونے والی تمام مباحث کو اپنی مدلّل تحاریر سے سمیٹ کر اب تک ہونے والی تمام تحقیق کو مدِنظر رکھ کر ایک مثبت، قابل عمل اور قابل قبول حل پیش کر دیا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ فتویٰ کی رو سے متعلق ہر چھوٹی بڑی دلیل، مضمون، جملے، یہاں تک کہ ذاتی نوعیت کی خط و کتابت تک کو نظرانداز نہیں کیا اور نہایت محنت سے تمام کو کتابی شکل میں پیش کر کے اب تک دستیاب حقائق کی روشنی میں یہ دو مسئلے حل کر دیئے ہیں۔ ویڈیو کی تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ خدمت لوح قلم اور مذہب و انسانیت کی طرف بھی حضرت اختر نے بہت توجہ دی اور ایک زود گو شاعر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بیش قیمت کلام نہ صرف تخلیق کئے بلکہ شائع کر کے انہیں ادب سے محبت کرنے والوں تک پہنچایا۔ کسی کا حق پہچانا اور لوگوں تک پہنچانا ایک بہت بڑا کام ہے جو حضرت اختر کے مزاج کا حصہ بھی ہے۔

حضرت اختر نے تفسیر قرآن کے خد و خال پر تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا جو تشنہ رہا ہو۔ اور نہ معلوم ان کے شخصیت کے کتنے اور سوتے ہیں جو ہمارے لئے نامعلومات کے پردوں میں ہیں

☆☆☆

غلام ربانی فدا

باران رحمت اور اختر کچھوچھوی کی نعت گوئی۔ ایک جائزہ

یو پی کے ضلع فیض آباد سے تعلق رکھنے والے اور صوفیانہ ماحول کے پروردہ جس شخص نے اپنے آباواجداد کے معتبر تہذیبی قدروں کی پاسداری کی اور عشق نبی ﷺ میں ڈوب کر جگر سوزی کی اور اس کے نتیجے میں جو عارفانہ فکر اشعار میں ڈھلے وہ ہے حضرت اختر کا خوبصورت اور پاکیزہ نعتیہ مجموعہ ”باران رحمت“

کسی بھی کتاب کے مطالعہ سے پہلے قاری جس کی طرف متوجہ ہوتا ہے یقیناً وہ اس کتاب کا سرورق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر شخص حضرت اختر کی کتاب کے مطالعہ کا شرف حاصل کرنے سے قبل کتاب کے سرورق کے دل فریب نظارے کا لطف ضرور اُٹھائے گا۔ اس کتاب کا سرورق دیدہ زیب، دل ونظر کو فرحت بخشنے والا گنبد خضرا جس کے سائے میں آرام فرما مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے لیے دل میں اُبھرتا ہوا احساس عقیدت پس منظر میں نیلگوں آسمان، آنکھوں کو ٹھنڈک پہچانے والی میناروں سے پھوٹتی ہوئی دودھیا روشنی، اور تقریباً ڈوب چکے آفتاب سے نکلتی ہوئی پیاری

مدھم شعاعوں سے دل میں ایک خوشگوار کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

چونکہ ہر مسلمان شاعر اپنی کتاب کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کرتا ہے اس لیے اپنی کتاب میں حضرت اختؔر نے بھی اس روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ جدّت پسندی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اللہ رب العزت کی شان میں ایک نہیں بلکہ کئ حمدیہ کلام شامل کیئے جو اللہ پر ایمان کی دلالت ثابت کرتا ہے ورنہ حقیقتاً یہ مجموعہ ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایک شاعر حمد معبود کے بعد اس کے حبیب کی نعت کہنا اپنا دینی فریضہ اور سکونِ قلب ونظر کا سامان سمجھتا ہے۔ حضرت اختؔر نے بھی اس فریضۂ دینی کو اسی قرینے اور خلوص وعقیدت کے ساتھ انجام دیا ہے۔

نعت گوئی یا مدحتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی سنت ہے۔ نعت قلم بند کرنے والے کی عزت وتوقیر بڑھانے اور اس کی ہمت افزائی اور مدد کرنا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس لیے کہ خود سرورکونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت کو اپنے سامنے منبر پر بٹھا کر نعت کے اشعار سماعت فرمائے ہیں اور ان کو جنت کی بشارت دی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت اختر نے نہ صرف اللہ کی سنت ادا کی بلکہ رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں نعت کہہ کر اللہ کی رحمت کے حقدار بن گئے۔

حضرت اختؔر کے ابتک کے حالاتِ زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق دینی گھرانے سے رہا ہے۔ جس کے سبب ان کے دل میں بچپن ہی سے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بے پناہ محبت اور عقیدت مندی موجیں مار رہی تھی۔ حضور کی مدح سرائی کے لیے دل تو بے قرار تھا لیکن ذہن اور زبان بھی اس کے لیے موزوں نہیں تھے۔ وجہ زمانہ ان کی طالب علمی کا تھا اور نعت گوئی وہ راہ ہے جہاں ہر قدم پر لغزش اور خطا کا امکان رہتا ہے۔ لیکن جب ذہن پختہ ہوگیا اور زبان موزوں تو پھر بطور نذرانہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نعت کے اتنے اشعار کہہ ڈالے کہ ایک زمانے کے بعد یہی اشعار ”باران رحمت“ کے نام سے کتابی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہیں۔ حضرت اختؔر خود

اس کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

بعض شعراء نے نعت کی مقبولیت اور تقدس کی وجہ سے دوسرے اصناف سخن سے اپنی زبان کو آلودہ کرنا پسند نہیں کیا۔ اس خیال نے حضرت اختؔر کے ذہن کو بھی ہم خیالی عطا کی اور وہ بھی اپنی شاعری کو اس مقدس صنف تک محدود رکھنے میں ہی اپنے لیے وسیلہ مغفرت و ذریعہ نجات سمجھی۔ اس قبیل کے چند اشعار ان کے مجموعے سے مشتے از خروارے حاضر ہیں:۔

خدائے و برتر بالا ہمیں پتہ کیا ہے
ترے حبیب مکرم کا مرتبہ کیا ہے
جبین حضرت جبرئی پر کف پا ہے
ہے ابتدا کا یہ عالم تو انتہا کیا ہے
خدا کی شان جلال و جمال کے مظہر

ہر ایک سمت ہے تو ہی ترے سوا کیا ہے

نعت کے لیے دل کی مستی و سرشاری کے ساتھ ہی دماغ کی ہوشیاری بھی نہایت ضروری ہے تا کہ شاعر افراط وتفریط سے بچ کر ربانیت اور نبوت کے امتیاز کو سمجھ کر اعتدال اور احترام کے ساتھ اپنا نذرانہ بارگاہِ رسالتمآب میں پیش کرے اور خطا کا امکان بھی نہ رہے۔ اس کا زبردست خیال اکٹر نے اپنی نعت گوئی میں رکھا ہے۔ اختؔر نے کبھی آپ کو اللہ کے ہم پلہ نہیں کہا۔ لیکن اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو مرتبہ اور شان وشوکت عطا کی اس کو گھٹایا بھی نہیں۔ صرف دو تین اشعار یہاں مثال کے لیے پیش کئے جاتے ہیں۔

خاک بے مایہ سے انسان بنایا مجھ کو
زیور دانش و حکمت سے سجایا مجھ کو
نقش پائے شہ عالم پہ چلایا مجھ کو
اے خدا شکر ترا، شکر ترا، شکر ترا
ساقئ کوثر و تسنیم کا میخوار کیا

بدۂ حب نبی سے مجھے سرشار کیا
دل تاریک کو رشک مہ ضوبار کیا
اے خدا شکر ترا، شکر ترا، شکر ترا
ماندگی مجھ میں جو پاتی ہے عنایت تیری
سرمۂ نیند لگاتی ہے عنایت تیری
میرا دکھ درد مٹاتی ہے عنایت تیری
اے خدا شکر ترا، شکر ترا، شکر ترا

حضرت اخترؔ اپنی نعتیہ شاعری میں رسول کی مدح سرائی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کلام کی دلنشینی اور طرز گفتگو کی اثر انگیزی کو مختلف انداز میں متعدد بار بیان کیا پھر بھی ان کا کلام تکرار کے عیب سے پاک نظر آتا ہے۔ یہ انوکھی بات ہے جو ان کی صفت بن گئی۔

ان کی نعت کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے۔ ان کے اشعار میں روانی پائی جاتی ہے۔ ذرا دیکھئے اپنی ایک نعت شریف میں حضرت اخترؔ نے کتنا سادہ عام فہم الفاظ میں امت مسلمہ کو پیغام دیا ہے۔ الفاظ کی سادگی نے اس نعت مقدس کو دلکش اور پُر کیف بنا دیا ہے۔ ذیل میں اس نعت کو پورا کا پورا درج کیا جاتا ہے۔ جس سے اس کی سادگی اور دل کشی کی تصدیق ہوتی ہے:۔

جی میں آتا ہے لپٹ جاؤں مزار پاک سے
کیا کروں ہے میرے ارمانوں کی قاتل احتیاط
اضطران عشق کا اظہارر ہو بے حرف و صوت
اے غم دل احتیاط اے وحشت دل احتیاط
عشق کی خود رفتگی بھی حسن سے کچھ کم نہیں
ہے مگر اس حسن کے رخسار کا تل احتیاط
ان کے دامن تک پہونچ جائیں نہ چھینٹیں خون کے
ہے تڑپنے میں بھی لازم مرغ بسمل احتیاط

حضرت اختر نے آپ ﷺ کے اوصاف و محامد، اخلاق و عادات اور سیرت و زندگی کی ممکن حد تک جہاں تک ان کا قلم اور ذہن ساتھ دے سکا مرصع سازی کی اور آپ ﷺ کے درجہ و مرتبہ کی عظمت و بلندی کو واضح کیا۔ اپنی نعتوں میں اختر نے بہت سادہ اور مانوس مگر خوبصورت اور پاکیزہ الفاظ استعمال کئے جس سے ان کے اعلیٰ ذوق اور عالمانہ دماغ کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری عارفانہ کیف و سرور کی مستی میں ڈوبی ہوئی شاعری ہے جو انہیں یادِ رسولؐ سے غافل ہونے نہیں دیتی۔

☆☆☆

غلام ربانی فدا

حضرت اختر کی شعری کائنات

میں یہ بات ضمناً نہیں صریحاً لکھ رہا ہوں کہ جو شعراء یا ادباء محض ایک زبان، اس کی تہذیب و ثقافت اور تلازمات سے آشنا ہوتے ہیں ان کی سوچ کا کینوس ذرا محدود ہوتا ہے، ان کی شاعری اور ادبی تحریریں خواہ وہ منظوم ہوں یا منثور بندھے ٹکے دستور یا سکہ بند اصول و ضوابط کے گرد گھومتی ہیں۔ دوسری زبان، ادب اور تہذیب و ثقافت کے روزنوں سے آنے والی ہوائیں اور روشنیاں انھیں اس قدر متاثر نہیں کر پاتیں جس قدر مختلف زبان و ادب سے واقف کار شعرا و ادبا کو متاثر کرتی ہیں۔ مختلف زبان و ادب سے نہ صرف آشنا بلکہ ان سے گہرا تعلق رکھنے والے شعرا و ادبا اور ناقدین کی سوچ کا کینوس محدود نہیں بلکہ وسیع ترین ہوتا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ مختلف زبانوں کے خطے، اس کے جغرافیائی، تمدنی، تاریخی حالات علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس کی تہذیب و ثقافت الگ ہوتی ہے۔ ایک زبان سے آشنائی کے معنی اس کے تمام تر لوازمات کی اکائی سے واقفیت کے ہیں۔

حضرت اختر کے جہان شعر کی سیر اپنے قاری کو کچھ اسی طرح کے احساسات سے دوچار کر

تی ہے۔ اردو میں شائع ہونے والے شعری مجموعوں اور رسالوں کے شعری حصوں کا مطالعہ ہمیں اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں ہونے والی اردو شاعری فکری اعتبار سے یکسانیت کی شکار ہے اگر ان درمیان کچھ افتراق ہے تو قوافی، ردائف اور زمینوں کا۔ لیکن ان شعری مجموعوں میں خال خال ایسے بھی نکل آتے ہیں جو اپنے اسلوب بیان، لہجے کی انفرادیت اور نئے فکری نظام کی بناء پر نہ صرف یہ کہ قارئین کی مکمل توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتے ہیں بلکہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے اور سوچنے سمجھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ چند رسائل کے شعری حصوں میں شامل کچھ شعرا کے کلام بھی دامن دل کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔

جب ہم حضرت اختر کے کلام کا بلاستعیاب مطالعہ کرتے ہیں تو مذکورہ یکسانیت سے پرے ان میں ایک امتیازی روش کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے اشعار ہمیں جگہ بہ جگہ چونکاتے بھی ہیں اور زبان و بیان کی نزاکتیں بھی یاد دلاتے ہیں۔ لفظوں پر حتمی طور پر دسترس نظر آتی ہے۔ الفاظ کو نئے ڈھب سے باندھنے کی ایک ہنرمندی ان کے یہاں صاف جھلکتی ہے۔ وہ لفظوں کی نشست و برخاست اور دروبست سے اچھی طرح واقف ہیں۔ محاورہ بندی، تشبیہات، استعارات اور علامات کا استعمال انھوں نے فراوانی کے ساتھ کیا ہے۔ وہ تو شب سیاہ میں بھی ساغر چھلکانے کا ہنر اچھی طرح جانتے ہیں۔

حضرت اختر کا زاویہ نگاہ قنوطی نہیں بلکہ رجائی ہے۔ ان کی طبیعت تو یاسیت زدہ ماحول میں بھی بیاض شعر اور غزل کی کتاب کی ورق گردانی کے ذریعہ نشاط آگیں فضا خلق کر لینے پر قادر ہے۔

ابھی چند سطور قبل میں نے حضرت اختر کی شاعری کے تعلق سے جو دعوے کئے ہیں۔ وہ قارئین کو مبہم معلوم ہوں گے لیکن ان دعوں کی دلیل کے طور پر جب بین السطور مناسب اشعار پیش کروں گا تو وہ دعوں کی دلیل بنتے چلے جائیں گے۔ میری بات کی تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ ان جملوں کی معنویت قارئین پر واضح ہو جائے گی۔

حضرت اختر کی شاعری ابہام، الجھاؤ، پیچیدگی، ژولیدہ بیانی اور ثقالت سے بہت حد تک پاک ہے۔ سوقیانہ پن شاید ہی نظر آئے۔ بھری بھرکم یا ثقیل الفاظ کے استعمال سے حضرت اختر اپنی شعری فضا کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ان کے اشعار کو پڑھتے وقت ایک سبک روی اور تسہیل شدت کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔ بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ کا سہارا لیکر بڑی بات کہنا کوئی کمال نہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ ان آسان لفظوں میں ہی بڑی اور گہری بات کہہ دی جائے جن کے معنوں کی تہوں تک پہنچنے کے لئے قارئین کو لغت کا رہین احسان نہ ہونا پڑے۔

یہ خوبی ہمیں یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری میں بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک خاص مردانہ وقار ہے۔ ان کا لب ولہجہ بہت بلند بانگ اور پروقار محسوس ہوتا ہے۔ ان کے کلام سے اس قبیل کے متعدد اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔

یگانہ کی زبان بڑی سلیس، رواں دواں اور با محاورہ ہے۔ یگانہ چنگیزی بیشتر کلام میں محاورہ بندی کا کمال اپنے عروج پر ہے۔ اب آیئے اس تناظر میں دیکھتے ہیں کہ حضرت اختر کا کلام میزان ومعیار کی کن بلندیوں پر اپنے قدموں کے نشاں چھوڑتا ہے۔

چونکہ اردو لشکری زبان ہے اس لئے مختلف زبانوں کے چیدہ الفاظ سے اس کا دامن مالا مال ہے۔ اس میں ایک مٹھاس اور شیرینی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے لہجے میں ایک خاص لطف اور نزاکت سرایت کرگئی ہے۔ حضرت اختر صاحب کا تعلق اردو اور انگریزی کے علاوہ فارسی سے بھی گہرا رہا ہے۔ بنا بریں ان کی شاعری میں جا بجا فارسی الفاظ اور تراکیب کے استعمال سے ایک نوع کی خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے جو قارئین کو بصری اور سماعی دونوں سطحوں پر متاثر کرتی ہے۔ فارسی الفاظ کو جمع کے صیغے میں قوافی کے طور پر استعمال کرنے سے بھی انھوں نے گریز نہیں کیا ہے۔

یہ بھی ہیں چہرۂ پرنور کے پروانے دو
دوش پر کاکل خمدار کو بل کھانے دو

کہہ رہی ہے رخ پہ بکھری ہوئی زلف حسیں
ابر کے پیچھے کوئی برق تپاں روپوش ہے

عام بول چال اور روبرو گفتگو کا انداز حضرت اختر کی شاعری کا ایک وصف ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس میں خود کلامی (Monolouge) کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں جو عام بات چیت کو فن لطیف سے قریب تر کرتی ہیں، اشعار کو Forceful اور حسین بناتی ہیں۔

عشق کی اصطلاح میں ہمدم
موت کہتے ہیں مسکرانے کو
آنکھ ہے اشک باریوں کے لئے
دل ہے چوٹوں پہ چوٹ کھانے کے لئے

رشتوں کی بھیڑ میں انسانی درد اور ہمدردی کے رشتے بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن دورِ حاضر میں دوستوں کے سلوک اور ملنے جلنے کے انداز نے دوستی کا مفہوم یکسر بدل دیا ہے۔ اس رویے کو مدنظر رکھتے ہوئے اختر جاوید یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ انہیں رفیقوں کی بدلتی ہوئی آنکھوں سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے دوستوں سے رشتہ منقطع کر لیتے ہیں اور وہ رسم بھی توڑ لیتے ہیں۔ محبت کا ایک نیا انداز انھیں ان کے دوستوں ہی نے سکھایا ہے کہ وہ جس کاغذ پر اپنے دوستوں کا نام لکھتے ہیں اُن کے دوست بے رخی کا ثبوت دیتے وہ کاغذ بھی موڑ دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اُن کا یہ خلاف توقع عمل شاعر کے دل میں ایک کُڑھن پیدا کرتا ہے۔

لب آشنا حرکت سے بھی نہ ہوں اور زیست کا حاصل آ جائے
خاموش زباں بھی خشک رہے اور ساقی محفل آ جائے
اتنی تو کشش دل میں میرے اے جذبہ کامل آ جائے
جب خواہش منزل پیدا ہو خود سامنے منزل آ جائے

اردو شاعری کا دامن رومانیت سے مالا مال ہے۔ بیشتر شاعروں کی شعری تخلیقات اور نثر نگاروں کے نثر پاروں میں عاشقی کی داستانیں پائی جاتی ہیں لیکن اُن میں صرف اور صرف رومان پسندی ہوتی ہے تقابلی انداز شاید ہی دیکھنے کو ملے۔ مگر اختر جاوید نے تقابلی حُسن کے ساتھ اپنے ایک شعر میں اہلِ عشق کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور عالمی تاریخ کے سفاک نیز ظالم و جابر کرداروں کی مذمت کرتے ہوے اُنکی مذموم حرکتوں کی حرف گیری کی ہے۔ اُنکا یہ شعر ہمیں معروف انگریزی شاعر اور ناول نگار Thomas Hardy کی ایک معرکتہ الا آرا نظم In time of breaking of nations کی یاد دلاتا ہے۔

حضرت اختر کی نگاہِ دور رس کبھی بُلند پروازی میں مصروف اُس طائر پر بھی مرکوز ہو جاتی ہے جو بلندی پر جا کر لوٹ آتا ہے اور کبھی پرواز کے دوران ہی اُسکے شہپر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس لئے وہ شکستگی کے احساس سے دو چار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس احساس شکستگی کے باوجود وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آتا ہے۔ بلکہ اپنی پرواز اور جدّ و جہد کو جاری رکھتا ہے: کبھی طائر بُلندی جا کر لوٹ آتا ہے کبھی پرواز کے دوران ڈینے ٹوٹ جاتے ہیں اختر جاوید کا شعری اثاثہ کافی بسیط اور قابلِ قدر ہے۔ اسکی مختلف جہتیں (Directions) اور ابعاد (Dimentions) ہیں۔ اگر اُنکے بارے میں ڈسکورس قائم کئے جائیں تو وہ ایک علیحدہ مضمون یا مکالمے کے متقاضی ہوں گے۔ بناء بریں اس بحث کو کسی دوسرے موقعے پر ٹالتے ہوئے اپنی اس گفتگو کو انہی کے ایک شعر پر سمیٹتا ہوں۔

مری امید کی موجیں یم تمنا سے
نہ کیوں تڑپ کے اٹھیں وقت اضطراب آیا

☆☆☆

روایت اور تہذیب کا امین شاعر؛ اخترؔ کچھوچھوی

اردو شاعری اپنے ارتقائی سفر میں مختلف ادوار کے تہذیبی اور معاشرتی حالات سے متاثر ہو کر موضوع و اظہار کے نئے امکانات کو دریافت کرتی رہی ہے 1874ء میں آزادؔ اور حالیؔ نے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں لا کر مصرعہ طرح پر شعر کہنے کی روایت سے گریز کر کے موضوعی نظموں کی ابتدا کی اور اس طرح 1857ء کے ہنگامہؑ غدر کے بعد انگریزی شعر و ادب کے بعض نمونوں سے واقفیت کے نتیجے میں فکر و نظر کی توسیع کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ اور اردو شعر کو غزل کی روایت سے ایک حد تک نجات دلا کر معروضی واقعات و مظاہر پر رابطہ وارتقا کے ساتھ غور و فکر کرنے کے رجحانات کو تقویت دی۔

آزادؔ اور حالیؔ کی نظم نگاری کا یہ رجحان غیر معمولی مقبولیت سے ہم کنار ہوا۔ اور پھر شبلیؔ، سلیم پانی پتی، سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، چکبستؔ، محرومؔ اور کیفی سے لے کر اقبالؔ، جوشؔ اور سیمابؔ تک ایک مستقبل رجحان بن گیا۔ اس شعری اظہار نے جہاں اردو شاعری کو فکر و خیال اور مطالعہ و مشاہدہ

کے نئے امکانات سے روشناس کیا وہیں اس کا حاوی میلان موضوع کی منطقی دروبست، توضیح، معروضیت اور طُول کلامی کی طرف ہوگیا۔ جس کی نمایاں مثال جوشؔ کی شاعری فراہم کرتی ہے۔ اس موضوع کی میکانکی نظم نگاری کے زیرِ اثر کئی شعراء 1874ء کے تاریخی سال سے پہلے غالبؔ کی قائم کردہ شعری روایت، جس کی بنیادی خصوصیات، اسراریت، داخلیت، پتہ داری اور ابہام ہیں، دور ہوتے گئے۔

حضرت اختر ایک بزرگ شاعر ہیں۔ ان کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزادؔ اور حالیؔ کی قائم کردہ شعری روایت سے اکتسابِ فیض کر رہے ہیں، ان کی نظمیں عام طور پر مظاہر فطرت یا آئے دن کے سماجی یا تہذیبی واقعات و حالات پر رواں دواں تبصرہ معلوم ہوتی ہیں۔ شاعری میں معاصرین یا متقدمین سے اثر قبول کرنے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اور یہ کوئی غیر مستحسن بات نہیں۔

اخترؔ صاحب کے یہاں بعض ایسی منظومات موجود ہیں جو اکبرؔ الہ اابادی، سیمابؔ اکبر آبادی، احسانؔ دانش۔ چکبستؔ اور اقبالؔ کے اثرات کی حامل ہیں۔ اثر و نفوذ کے اس عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔

حضرت اختر گرد و پیش کی زندگی کے بعض سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات و واقعات کا دردمندی اور خلوص سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اپنے جذبات و خیالات کو استادانہ مہارت سے نظم کرتے ہیں۔ وہ تیز ذہن اور چشم نگراں رکھتے ہیں اور سماجی زندگی کی بے انصافیوں اور تقاضوں کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ خارجی ماحول کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ اختر صاحب بعض لمحوں میں اپنی داخلی زندگی کا سفر بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کی غزلیات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی جذباتی کیفیات کو غزل کے مسلمہ الفاظ و تراکیب میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ اختر صاحب زبان کی صحت اور الفاظ و تراکیب کی درستگی کا خیال رکھتے

ہیں ۔۔ان کی غزلوں کے بعض اشعار میں داخلی جذبات حسن وخوبی سے ادا ہوتے ہیں ۔

……☆☆……

فقاہت وعلمی جلالت میں باکمال

علامہ اختر کچھوچھوی بحیثیت عالم دین ومفتی جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ، دلائل وبراہین کے انبار لگا دیتے ہیں، وہ کسی بھی مسئلے پر طائرانہ نظر ڈالنے کی بجائے بحث وتحقیق کی انتہاء کو پہنچتے ، مسائل کی تنقیح اور تفصیل پر آتے ہیں تو دریا کی روانی اور سمندر کی وسعت کا نقشہ نظر آتا ہے، متقدمین فقہاء کے اقوال مختلفہ میں تطبیق دیتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اختلاف سرے سے تھا ہی نہیں ۔

علامہ اختر کچھوچھوی علم حدیث اور اس کے متعلقات پر وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں، طُرقِ حدیث ، مشکلاتِ حدیث ، ناسخ ومنسوخ ، راجح ومرجوح ، طُرقِ تطبیق ، وُجوہِ استدلال اور اسماءِ رجال ، یہ سب اُمور اُنہیں مستحضر رہتے ہیں ، کہ جتنی حدیثیں فقہ حنفی کی مآخذ ہیں ، ہر وقت پیشِ نظر اور جن حدیثوں سے بظاہر فقہ حنفی پر زد پڑتی ہے ، اس کی روایت ودرایت کی خامیاں ہر وقت از بر ، علم الحدیث میں سب سے نازک شعبہ علم اسماء الرجال کا ہے ، **علامہ اختر کچھوچھوی** کے سامنے کوئی سند پڑھی جاتی اور راویوں کے بارے دریافت کیا جاتا تو ہر راوی کی جرح وتعدیل کے جو الفاظ فرما دیتے ، اٹھا کر

دیکھا جاتا تو تقریب وتہذیب اور تذہیب میں وہی الفاظ ملتے، اس کو کہتے ہیں علم راسخ، علم سے شغف کامل اور علمی مطالعہ کی وسعت ۔

علامہ اختر کچھوچھوی کی جلالت علمی کا یہ عالم تھا کہ انہیں جو عالم بھی ملا، عقیدت واحترام سے ملا اور ہمیشہ کیلئے ان کا مداح بن گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ **علامہ سید محمد مدنی میاں اختر** سے شدید اختلاف رکھنے والے بھی ان کی فقاہت اور تبحر علمی کے قائل تھے، **لامہ سید محمد مدنی میاں اختر** میں بہت سی مجتہدانہ خصوصیات پائی جاتی تھی اور ان کے بیان واستدلال میں واضح طور پر اجتہاد کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس کے باوجود تکبر اور عُجب کی زد میں نہیں آتے ۔

اَخلاقِ کریمانہ

علامہ مدنی کی ذات گرامی [الحب للّٰہ والبغض للّٰہ] کی عملی مصداق تھی، آپ کسی سے محبت فرماتے تو اللہ کیلئے اور مخالفت فرماتے تو اللہ ہی کیلئے، کسی کو کچھ دیتے تو اللہ کیلئے اور منع فرماتے تو اللہ کیلئے

حضور شیخ الاسلام کا ہمیشہ معمول ہے کہ تصنیف وتالیف، کتب بینی، اوراد ووظائف میں اِشغال کے خیال سے خلوت نشینی اختیار فرماتے، پانچوں نمازیں مسجد یا حجرہ میں ہمیشہ باجماعت ادا فرماتے ہیں۔

حضور شیخ الاسلام وضو وغسل میں بہت احتیاط فرماتے، عموماً دو لوٹے پانی سے وضو فرماتے

حضور شیخ الاسلام خطوط کے جوابات کا بہت اہتمام فرماتے، اگر استفتاء بہت اہم ہوتا تو خود تصنیف فرماتے ہیں۔

حضور شیخ الاسلام وعظ وتقریر کا ایک زمانہ عاشق عوام تو عوام علما بھی بہت سنجیدگی کے ساتھ آپ خطاب سماعت کرتے ہیں۔ ان دونوں حضرت **حضور شیخ الاسلام** کی تفسیر اشرفی المعروف بہ اشرف التفاسیر کی تکمیل بھی ہو چکی ہے۔

☆☆☆☆

اختتامیہ

میں وابستگان سلسلۂ اشرفیہ وعقیدتمندان **حضورشیخ الاسلام** سے درخواست کرتا ہوں کہ میں نے کچھ نشانات چھوڑ رہا ہوں اگرکسی قابل سمجھیں تو اس پرعمل آوری کیجئے۔

کسی یونیورسٹی سے **حضورشیخ الاسلام** کی فن وشخصیت اور دینی ادبی خدمات پرتحقیق کرائی جائے۔ نیزیہ بات بھی سامنے رہے کہ پہلے مقالے کی طرح اس میں صرف خطبات برطانیہ سے تقاریر نہ لئے جائیں بلکہ مقالہ ٹھوس ہو جس میں حضرت کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرنے کی ہرممکن کوشش کی جائے۔

جلسے جلوس کی بجائے غیر مطبوعہ وتازہ تصانیف **حضورشیخ الاسلام** و مضامین نگارحضرات کے مضامین ومقالے شائع کیئے جائیں۔

جلسے وجلوس کا اثر وقتی ہوتا ہے اور کتب ورسائل کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔

حضورشیخ الاسلام حضرت اختر پر کام کرنے والے کی ہمت افزائی وتعاون کیا جائے۔ ہمارا تو معمول یہ ہے کہ کسی کا تعاون تو دور ہمت افزائی کے دو جملے بھی نہیں بول سکتے۔ ناچیز ہی کے ساتھ یہ معاملہ رہا۔ اگر یہی ہماری روش رہی تو کوئی بھی قلم اٹھانے کی جرات نہیں کرے گا۔

حضورشیخ الاسلام کا ادنیٰ مرید بھی خود کو خلیفہ سے کم نہیں سمجھتا ہر ایک خود کو خادم اہل بیت تصور کر کے کام کرے۔

کچھ تحریکیں وادارے خود مختاری کے ساتھ کام کر رہے ہیں انہیں جانشین محدث اعظم یا جانشین

حضور شیخ الاسلام کے سامنے جوابدہ بنایا جائے۔

حضور شیخ الاسلام کے نام پر جدید سہولیات کے ساتھ ادارے اور لائبریری قائم کئے جائیں ورسالہ جاری کیا جائے۔ جو حضرت کے افکار و نظریات کی ترجمانی کر سکے۔ کرناٹک بھر کوئی بھی لائبریری نظر نہیں آتی سلسلہ اشرفیہ کے تمام مطبوعات وغیر مطبوعہ تصانیف سے استفادہ کر سکے۔

اس جانب مدنی فاؤنڈیشن یا پھر مدنی میاں عربک کالج جلد ہی پہل قدمی کرے تو مناسب ہوگا۔

حضور شیخ الاسلام کی متفرق خصوصیات پر قلمکار حضرات سے رابطہ کر کے مضامین و مقالے لکھوائیں جائیں۔ اور انہیں شائع کرائے جائیں۔

حضور شیخ الاسلام کی ادبی و مذہبی خدمات پر سیمینار کا انعقاد کیا جائے۔ اور سیمینار عصری تناظر میں ہو، جہاں نعرے بازی کے بجائے مثبت سوچ ہو۔

حضور شیخ الاسلام کے جہات در جہات شخصیت پر ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جائے۔ جہاں ٹھوس وصالح اقدار پر کام ہو۔

خلفائے **حضور شیخ الاسلام** کے اختلافات کو ہوا نہ دی جائے۔ اور ذاتی معاملات کو مشربی مسئلہ نہ بنائیں۔

میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں میری یہ باتیں کچھ اپنوں کو نہایت ہی تکلیف دے رہی ہیں اور کچھ **حضور شیخ الاسلام** کے نام پر کھانے پینے والوں کو نہایت اذیت دے رہی ہیں۔ کبھی ہم نے غور کیا، حضور محدث اعظم ہند کی مطبوعات وتصانیف وخدمات پر کتنا کام ہوا۔ کام تو دور کی بات ہے احقر نے سوانح محدث اعظم ہند کے لئے دہلی و کچھوچھہ کے بازار کھنگال ڈالے مگر ایک عدد کتاب دستیاب نہ ہوسکی۔ کچھ نہ وعدے تو کئے مگر اب تک وفا نہیں کئے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں؟؟؟ کیا آپ اب یہ بھی چاہتے ہو کہ **حضور شیخ الاسلام** بھی رسالہ اشرفی کی طرح چند سالوں بعد صرف لوگوں زبانوں یا ذہنوں

پر باقی رکھیں اور اس کے بعد کا انجام آپ خود جانتے ہیں۔

زندہ قومیں اپنے اسلاف کی یادوں کو نہیں مٹاتی ہیں۔ اللہ رب العزت ہم وابستگان **حضور شیخ الاسلام** کو عقیل سلیم عطا فرمائے نیز اہل بیت کی محبت میں موت عطا فرمائے۔

غلام ربانی فداؔ

شخص و عکس

ظہیر رانی بنوری

غلام ربانی فداؔ کو شعر و ادب میں اردو ادب سے عموماً اور مذہبی ادب سے خصوصاً دلچسپی اور شغف ہے۔ نثر و نظم دونوں اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اردو کے اُبھرتے ہوئے عمدہ نعت گو شاعر، قلم کار اور نعتیہ ادب کے جواں سال محقق و ناقد میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کا طرزِ تحریر انتہائی دل نشین، شگفتہ اور سلیس ہے، مذہبی، اصلاحی، سماجی، تعلیمی اور ادبی موضوعات پر اب تک درجنوں تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی مضامین و مقالات نہ صرف مقامی اخبارات بلکہ ملکی و بین الاقوامی اخبارات و رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ موصوف کے کئی اہم مضامین کے دوسری زبانوں میں تراجم بھی ہوئے ہیں۔ شاعری میں موصوف نے حمد و مناجات و دعا، نعت گوئی،

سلام، اولیاے کرام کی شان میں مناقب نگاری اور مقتدر علماے کرام کے لیے نذرانۂ عقیدت، غزل گوئی، نظم نگاری کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔

غلام ربانی فداؔ کی پیدائش ہیرور (ضلع ہاویری) میں ہوئی۔ والدہ ماجدہ فیروزہ بانو شیو پور تعلقہ ہانگل کی متوطن ہیں اور والد جناب نور احمد اپنے علاقے کے مشہور سیاسی لیڈر رہیں۔ ہیرور اور ڈانڈیلی (ضلع کاروار) حیدرآباد (دکن) میں تعلیم کے جملہ مراحل طے ہوئے تو حافظ قرآن و قاریٔ کی سند ڈانڈیلی سے حاصل کی اور درس نظامی، بی اے، ڈپلومہ ان عربک کی حیدرآباد میں تعلیم مکمل کی۔ دین و ادب کی خدمت سے جڑ گئے ہیں۔ اللہ رب العزت نے بہت ہی کم عمری میں بے پناہ شہرت عطا کی۔ نثر او رنظم میں تحریریں اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور حمد و نعت کے فروغ کے لئے سراپا اضطراب ہیں۔ اسی بنا پر اگست ۲۰۱۰؁ میں آل انڈیا تحریک فکر نعت کی بنا رکھی۔ جس کا مقصد مستحق نعت گو شعرا کے مجموعہائے کلام شائع کرانا، ادب نعت کے حوالے سے مذاکرے، نعتیہ مشاعرے منعقد کرنا۔ خالص حمد و نعت کا رسالہ جاری کرنا ہے۔ مرکزی حمد و نعت اکیڈمی دہلی کے رکن اور حمد و نعت اکیڈمی شاخ ریاست کرناٹک کے ریاستی صدر ہیں۔ اور ہندوستان کا پہلا حمد و نعت کا معیاری ادبی رسالہ جہان نعت کا اکتوبر ۲۰۱۰؁ء میں ہری ہر سے آغاز کیا اور الحمد اللہ جہان نعت مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ جس کے ذریعے حمد و نعت کہنے والے شعرا کی فکر سازی کی جا رہی ہے۔ عالمی سطح حمد و نعت کا پہلا ویب ورژن رسالہ دوماہی جہان نعت بھی شائع ہو رہا ہے۔ تمام شمارے انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں جسے مشہور سائٹ گوگل پر jahan-e-naat کے الفاظ میں Search کیا جا سکتا ہے۔ شاعری کی ابتدائی دور میں جناب میکش اجمیری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ریاست و بیرون ریاستوں کے مختلف اہم شہروں میں مشاعرے پڑھنے کے مواقع ملے۔ ملک و بیرون ملک کے رسائل و اخبارات میں کلام اور مضامین شائع ہوئے۔ اشاعت کا یہ سلسلہ ۲۰۰۵ سے آج تک جاری ہے۔ آل انڈیا تحریک فکر نعت کے زیر اہتمام اب تک درجن سے

زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ الحمدللہ چودہ کتابوں کے مرتب ومصنف ہیں

تصنیف وتالیف شائع شدہ (بحیثیت مصنف ومرتب؛۔

☆نعتیہ مجموعہائے کلام 1)"گلزار نعت"۔ 2)"جلوہ گاہ طیبہ"

☆غزلیات 3)۔"شہر آرزو میں" اور غزلیہ دیوان 4)۔"صحرائے سخن"،

☆سوانح نگاری میں 5)۔"سید مقبول۔۔۔۔۔کہ گم اس میں ہیں آفاق" ۔ 6)۔داستان کربلا "صحرا لہو لہو"

☆مضامین کے مجموعے 7)۔۔"قلم آشنا"۔ 8)۔"آداب نعت گوئی" 9)۔علامہ اختر کچھوچھوی فن وشخصیت"

☆قرآن اور عصری تحقیقات پر مشتمل 10)۔"قرآن اور کائنات"

☆انٹرویوز پر مشتمل کتاب 11)۔"روبرو جلد اول" مرتب

مرتب کردہ

"جیلانی شاہد کے تین مجموعہائے کلام 12)۔"جہاں محمد وہاں خدا ہے" (نعتیہ) 13)۔خوشبوئے صبا (غزلیات) 14)۔گلہائے رنگ رنگ (مختلف اصناف سخن)

اس کے علاوہ نثر و نظم پر مشتمل مذہبی و ادبی ۲۲ کتابیں اشاعت کے منتظر ہیں۔

زیر قلم:

*سیرتِ رحمتِ عالم (منظوم) *القرآن المنظوم (کلام اللہ کا لفظی اردو منظوم ترجمہ) *" 150 جعلی راویان حدیث"۔ مسکراہٹوں کی چبھن (ناول) برسات کا آنگن (افسانے) کوئی ہے (مناقشہ)

اس کے علاوہ انٹرنٹ پر ادبی سرگرمیاں ۲۰۰۸ء سے جاری ہیں۔ کئی ویب سائٹس کا رکن ہیں اور ان سائٹس پر کلام ومضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔

اعزازات

فیضان رضا ایوارڈ ۲۰۰۹

حسان بن ثابت ایوارڈ ۲۰۱۰۔

ذمہ داریاں:

بانی صدر آل انڈیا تحریک فکر نعت ہیرور

صدر حمد و نعت اکیڈمی شاخ کرناٹک

ممبر مرکزی حمد و نعت اکیڈمی نئی دہلی

مدیر اعلیٰ جہان نعت ہیرور

رابطہ؛

GULAM RABBANI FIDA
Editor **JAHAN-E-NAAT**
C/o Noor Ahmed Akki, Post: Hirur
Tq: Hangal, Dist: Haveri-581104
(karnatak india)
Mobile: +919741277047
Email: jahanenaat@gmail.com
gulamrabbanifida@gmail.com
website: www.wafasite.com
www.gulamrabbanifida.wafasite.com